دِل ٹوٹ کے ہارا تھا



نایاب جیلانی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

مکمل ناول

دل ٹوٹ کے ہار اٹھا

نایاب جیلانی

بیک گراؤنڈ میں میوزک تیز آواز میں بج رہا تھا۔ بجتے میوزک کے ساتھ اس کی تھرکتی انگلیاں آئی پیڈ پر مسلسل حرکت میں تھی۔ کانوں میں ہیڈ فون لگا تھا اور وہ اپنی بیسٹ فرینڈ ماہم سے باتوں میں مصروف تھی۔ جو پچھلے بہت سارے دنوں سے غائب تھی اور ابراڈ منگنیاں اٹینڈ کرتی پھر رہی تھی۔ فیشن شوز انجوائے کرتی فی الحال واپس نہ آنے کا پتا کرا سے شدید بوریت اور جھلاہٹ میں مبتلا کر رہی تھی۔ ماہم سے لمبی بات کے دوران بار بار اس کا سیل بلنک کر رہا تھا۔

وہ اچٹتی سی نگاہ موبائل اسکرین پہ ڈالتی اور پھر مزے سے ماہم کو کوئی اور قصہ سنانے لگتی۔

قریب آٹھویں بیل پہ اس نے شدید جھلا کر ماہم سے رابطہ منقطع کیا تھا اور پھر اپنا بجتا سیل اٹھالیا۔ اسکرین پہ فریحہ کالنگ لکھا آرہا تھا۔ اس کی پیشانی پہ سوچ کی لکیر ابھری۔

فریحہ اس کی کلاس فیلو تھی۔ گوکہ فریحہ اور اس کے مزاج میں زمین آسمان جتنا فرق تھا۔ اور یہی فرق اسٹینڈرڈ میں بھی تھا۔ پھر بھی ان کی دوستی ابھی تک چل رہی تھی۔

یونی ورسٹی میں بھی فریحہ ہمیشہ اس پر انحصار کرتی تھی۔ اپنی ہر پرابلم اس کے پاس اٹھا کر لے آتی۔ اور وہ چٹکی بجاتے اس کی پرابلمز سولو کر دیا کرتی تھی۔

یونی ورسٹی کے بعد بھی فریحہ کو جب جب اس کی ضرورت پڑتی۔ وہ اسے ضرور کال کرتی۔ اور اس میں لاکھ نخرہ سہی، پراوڈی، موڈی سہی لیکن ایک بات طے تھی کہ اس میں ”مروت“ کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ انکار تو کر ہی نہیں سکتی تھی کچھ بھی ہو جاتا۔ موڈ ہوتا نہ ہوتا۔ ٹائم ہوتا نہ ہوتا۔ وہ مروت ضرور نبھا دیتی تھی۔ اور اب بھی فریحہ کو اس سے کچھ ضروری کام تھا۔ جس کی تفصیل بتا رہی تھی۔

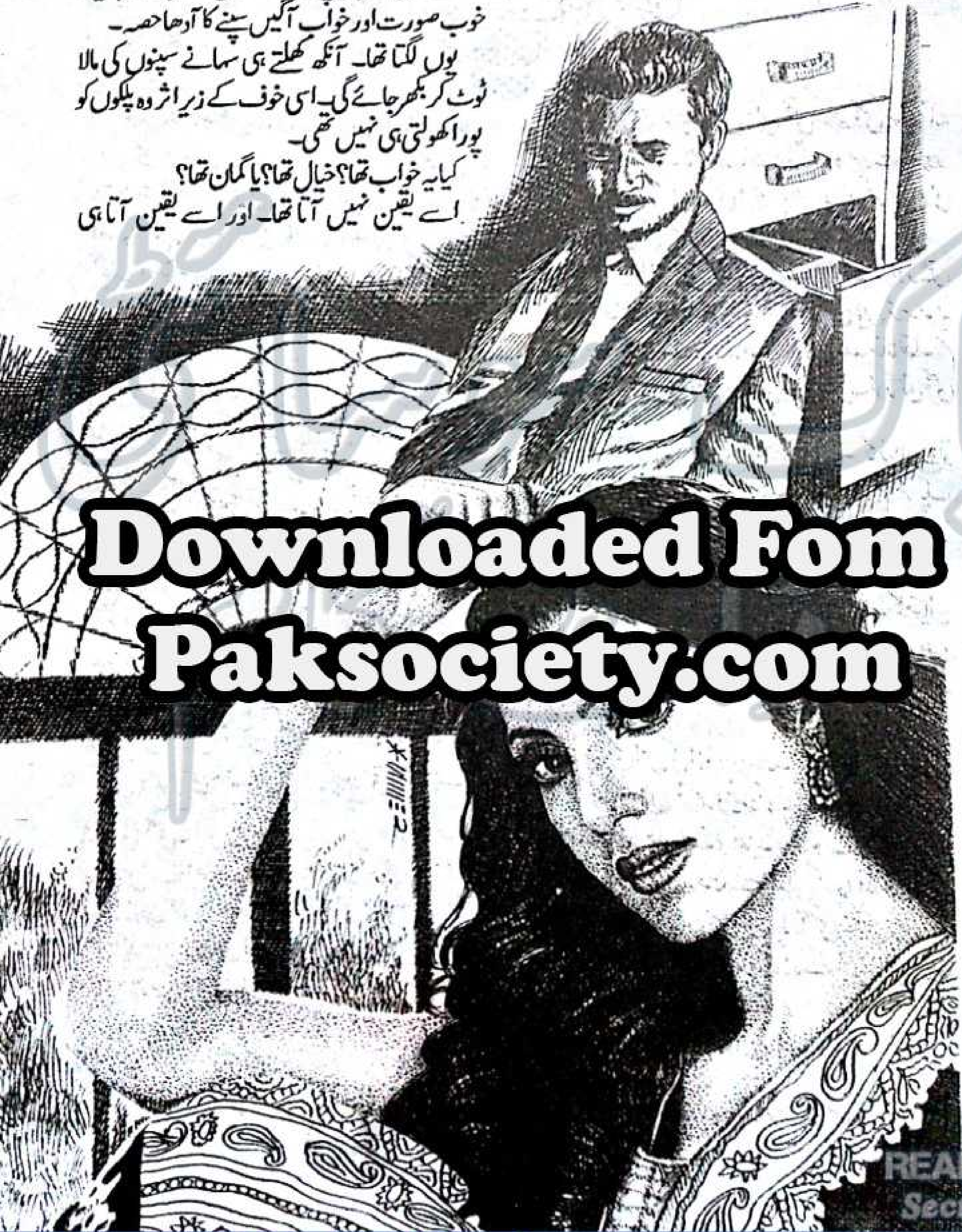
”ہما، سمیرا، سعدیہ کو کچھ شاپنگ کرنا ہے۔ اور میں نے بھی جاب کی ٹریٹ دینی تھی۔ وہ کہتی ہیں ٹریٹ نہ دو۔ ایک ایک سوٹ لے دو۔ ذرا بازار تک جانا تھا۔ تم تو جانتی ہو گھر سے خاص پرمیشن نہیں ملتی۔ اور مل بھی جائے تو کنوینس پرابلم اپنی جگہ موجود ہے۔ گاڑیاں دو تو ہیں لیکن وہ باقی لوگوں کے تصرف میں ہیں۔ تم اگر پک کر لو تو۔ میں کالج میں ہوں۔“ فریحہ نے اس قدر لجاجت سے کہا تھا کہ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی اقرار کرنا پڑا تھا۔ گوکہ فریحہ وغیرہ کے ساتھ شاپنگ کا خیال ہی سوہان روح تھا۔ کہاں چھوٹے چھوٹے بازاروں میں دھکے کھاتا۔ خوار ہوتا۔ اور گرمی بھی ایسی قیامت کے حد نہیں۔

لیکن وہی اس کی ازلی مروت۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اپنی شاندار سوک میں فریحہ وغیرہ کو پک کر رہی تھی۔ اور جب جگہ جگہ دھکے کھا کے وہ لوگ رحمان پلازہ پہنچیں تب اسے شدت سے خیال گزرا تھا کہ زندگی میں پہلے کیوں نہیں وہ اس جگہ پہ آسکی۔ اس دن کے بعد کئی لوگوں نے اسے رحمان پلازہ کے آس پاس دیکھا تھا۔ اور وہ چشم دید گواہ بھی تھے۔



یہ ایک خوب صورت سہ پہر کا منظر تھا۔

سفید بادلوں کے ننھے گولے گول گول چکر لگا رہے تھے۔ درختوں کی اونچی شاخوں سے کچھ اوپر ابابیلوں کا پورا غول پھدکتا اور اڑاڑ کر کرتب دکھا رہا تھا۔
ایک قطار میں رکھے سرخ گملوں میں گیندے کے پیلے پھول اتنے حسین لگ رہے تھے کہ دل چاہتا سارے توڑ کر جھولی میں بھر لے۔
لیکن فریحہ کی امی سے خائف وہ پھولوں کو نگاہ بھر کے بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔
یہ ایک نگاہوں کو تراوٹ دیتا انتہائی دلنشین منظر تھا۔ اور اس گھر میں پورے استحقاق سے چلنا پھرنا ایک خوب صورت اور خواب آگیں سپنے کا آدھا حصہ۔
یوں لگتا تھا۔ آنکھ کھلتے ہی سہانے سپنوں کی مالا ٹوٹ کر بکھر جائے گی۔ اسی خوف کے زیر اثر وہ پلکوں کو پورا کھولتی ہی نہیں تھی۔
کیا یہ خواب تھا؟ خیال تھا؟ یا گمان تھا؟
اسے یقین نہیں آتا تھا۔ اور اسے یقین آتا ہی



نہیں تھا۔ اس گھر میں قدم رکھنے تک وہ ایک خواب کے سفر میں رہی تھی۔ ایک لمبا حسین اور پر لطف خواب کا سفر۔

ایک تازہ پھولوں سے بھرا بھرا سجا سجا سا راستہ اور من پسند ہم سفر۔ جی چاہتا آنکھیں بند کر کے چلتی رہے۔ چلتی رہے۔ کہیں رکے نہیں۔

لیکن ہوا کیا؟ خواب کا وہ لمبا سفر اک چھناکے سے ٹوٹ گیا۔

گیندے کے پھولوں کی مالا ایسی بکھری کے ریزہ ریزہ ہوتی چلی گئی۔

بہت اچھا، بہت حسین سفر کا گمان کرنے والی کو اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ پیروں تلے پھولوں کی پتیاں نہیں نوکیلے کانچ کے ٹکڑوں کی روا بچھی ہے۔ وہ تو جانتی ہی نہیں تھی۔



فون کب کا بند ہو چکا تھا۔ اسے بند ہونا ہی تھا۔ اور جس تواتر سے فون آرہے تھے۔ کوئی چونکتا یا نہ چونکتا وہ خود چوکنا ہو گئی تھی۔

پہلے تو اس رفتار سے کبھی اس نے کالز نہیں کی تھیں۔ نہ وہ ایسی گہری محبت میں مبتلا تھی جو دن میں کئی کئی بار کال کر کے اس کا احوال پوچھتی۔

اور اس کا غائبانہ سا انداز وہ کہتی کچھ تھی۔ اور جواب کوئی اور سمجھتی۔

وہ اتنی غائب دماغ کبھی بھی نہیں تھی۔ کبھی بھی نہیں۔

اور آج کی کال میں اس نے ایک بڑی حیران کن بات کی تھی۔ اتنی حیران کن کہ اس کا دماغ گھوم گیا تھا۔ اس کے اعصاب مفلوج ہو گئے تھے۔ پھر اس کا اصرار۔ ضد اور آخر میں التجائیں۔

"پلیز مان جاؤ نا۔ مجھے نیا موبائل لینا ہے تم ساتھ ہو گی۔ تو اچھا تاثر رہے گا۔ مجھے بھی تسلی ہو گی۔ پلیز مان جاؤ فریحہ!" اس کی منتوں میں ایسی عاجزی تو کبھی نہیں رہی تھی۔ بس ہاتھ جوڑنے کی کسر باقی رہ گئی تھی۔ اور فریحہ کا دماغ تو سنگ سنگ کر سن ہو رہا تھا۔ سوچ سوچ کر تھک رہا تھا۔

"تم وہاں سے موبائل لینا چاہتی ہو؟ کیوں؟ پہلے تو تمہاری شاپنگ دبئی سے ہوتی ہے۔ تم نے تو یہاں کی کبھی لپ اسٹک استعمال نہیں کی۔ کجا کہ موبائل۔"

فریحہ کو نجانے اور بھی کیا کچھ یاد آگیا تھا۔ اور اس نے بے ساختہ بیچ میں اس کا فقرہ کاٹ دیا۔

"مجھے وہیں سے لینا ہے پلیز! تمہارے تایا کی شاپ ہے۔ تم ساتھ چلو گی' بس ڈن ہوا۔ میرے لیے اتنا سا کام نہیں کر سکتیں؟" اب وہ جذباتی حربوں سے اسے زیر کر رہی تھی۔ مرتا کیا نہ کرتا' اس نے جانے کس دل سے حامی بھری تھی۔ اسے حامی بھرنی ہی تھی۔ کیونکہ تقدیر یہی چاہتی تھی۔ جو اچانک آسمان سے اترتے اور نصیب کے فاصلوں کا سبب بن جاتے۔ اس نے فون رکھا اور بے دم ہو گئی۔ جو اس کا دل اشارے دے رہا تھا۔ جن وسوسوں کو اس کی سانسیں محسوس کر رہی تھیں۔ کیا وہ سب درست تھا؟

اس نے دل کی آواز پہ کان لگائے اور ساکت ہو گئی۔ اس کا کوئی بھی خدشہ بے بنیاد نہیں تھا۔



فائیو اسٹار ہوٹل کا اندرونی ماحول خاصا سحر انگیز اور پرسکون تھا۔ بیک گراؤنڈ میں کہیں۔ دھیما میوزک اس سحر طرازی میں اضافہ کر رہا تھا۔

ہوٹل کے اندر باہر کی نسبت خاصی چہل پہل تھی۔

اس وقت یقیناً "رحمان پلازہ میں انتہا کا رش تھا۔

اس کے باوجود ماہ رو کی فرینڈز بھری دوپہر میں اسے گھسیٹ کر رحمان پلازہ کی طرف لے جانا چاہتی تھیں۔ اور وہ جو انہیں اپنی ذاتی کار میں برج اور جنریشن زون لے کر آئی تھی۔ اس وقت سخت پچھتا رہی تھی۔

کیونکہ برج میں فکس ریٹس اور ایک ہی دام واحد کلام کی صورت حال نے اس کی تمام فرینڈز کو سانپ سونگھا دیا تھا۔ وہ کچھری بازار اور اچھرے سے شاپنگ

کرنے والیاں کہاں "برج" کی چمک دمک کو جھیل سکی تھیں۔ ان چاروں کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ اور چہرے حواس باختہ ہو چکے تھے۔ اور جیسے ہی وہ ایئر کنڈیشنڈ ہال سے باہر نکلیں ماہ رو ان سب پر برس پڑی تھی۔

"کوئی ایسے بھی شرمندہ کرواتا ہے؟ ایک ایک چیز کو چھو کر، ٹیگ دیکھ کر، چھان پھٹک کے خالی ہاتھ واپس چلے آنا۔" ماہ رو کا غصہ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔ تب اس کی دوست فریحہ نے دبے دبے الفاظ میں سمجھایا۔

"یار! ان سب کی جیب اتنی لمبی چوڑی قیمتوں تک رسائی نہیں کر سکتی۔" فریحہ نے اسے کول ڈاؤن کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا۔ وہ ڈیزائنر گلاسز آنکھوں پہ چڑھاتی آگے بڑھ گئی تھی۔ اور اسے اب کی دفعہ فائیو اسٹار کی بلڈنگ کے قریب جاتے دیکھ کر وہ ایک مرتبہ پھر ایک دوسرے کا منہ دیکھتی رہ گئی تھیں۔

پھر مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق انہیں ماہ رو کے پیچھے آنا ہی پڑا۔ گو کہ وہ سب پہلی مرتبہ کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں آئی تھیں تاہم خوامخواہ کنفیوز ہو کر ماہ رو کا غصہ بڑھانا نہیں چاہتی تھیں۔

اور دوسری جانب ماہ رو دل ہی دل میں خوب پیچ و تاب کھا رہی تھی۔

"ان بونگی پینڈوؤں کے ساتھ آنے کی ضرورت کیا تھی؟ سارا امیج خراب کر کے رکھ دیا ہے۔ ایک تو اتنی بڑی بڑی چادروں کی بکل مار رکھی ہے۔ اوپر سے شکل بھی یتیموں جیسی۔" ماہ رو دل ہی دل میں انہیں برا بھلا کہتی مینو کارڈ اٹھا کر آرڈر سوچ رہی تھی۔ جبکہ مودب سا ویٹر گاہے بگاہے چور نگاہوں سے ماہ رو کے حسین دلنشین چہرے کو ضرور دیکھ لیتا تھا۔ اور یہ کوئی نئی بات تو نہیں تھی۔ ماہ رو کے ساتھ جب جب اور جہاں جہاں جانے کا اتفاق ہوا تھا وہاں کم و بیش ایسی ہی صورت حال دکھائی دی تھی۔

جہاں ماہ رو ہوتی تھی وہاں کوئی بھی دوسرا پس منظر میں چلا جاتا تھا۔

فریحہ کو ماہ رو کے ساتھ قریب دس سال ہو چکے تھے۔

انہوں نے ایک اسکول اور ایک کالج میں پڑھا تھا۔ یونیورسٹی سے ایم۔ ایس۔ سی کی ڈگری لے کر ماہ رو تو کچھ عرصہ ابراڈ بھی رہ آئی تھی تاہم فریحہ نے ایک مقامی پرائیویٹ کالج میں جاب کر لی۔

یہ اس مہینے کی پہلی تاریخ تھی اور فریحہ کو پہلی پہلی تنخواہ مل رہی تھی۔ سو وہ اپنی یونیورسٹی فیلوز کو ٹریٹ کے بہانے باہر لے آئی۔ ارادہ تھا کہ سب کو لان کا ایک ایک سوٹ لے دے گی۔ اور باقی سعدیہ، ہما اور سمیرا نے گھر کی شاپنگ بھی کرنی تھی۔

چونکہ ماہ رو کا فریحہ سے یونیورسٹی کے بعد زیادہ رابطہ رہا تھا سو جب بھی موقع ملتا وہ خود فریحہ سے ملنے آجاتی تھی۔ فریحہ کے علاوہ ان کی ایک اور دوست ماہم بھی تھی۔ ماہم بھی ماہ رو کی طرح اپر کلاس سے تھی لیکن ماہم کو یونی فیلوز سے میل جول پسند نہیں تھا۔ ویسے بھی آج کل وہ دبئی کی فیشن شو کی تقریب میں گئی ہوئی تھی۔ ماہم کے بعد ماہ رو پہ بوریت سوار ہوئی تو اسے فریحہ سے ملنے کا خیال آگیا تھا۔ گو کہ فریحہ اور ماہ رو کا مزاج قطعاً "میل" نہیں کھاتا تھا پھر بھی یہ دوستی کی گاڑی چل ہی رہی تھی۔ اس میں کچھ کمال ماہ رو کا بھی تھا۔ اپنے ہزار نخرے، حسن اور دولت پہ ناز ہونے کے باوجود ماہم کے ہزار مرتبہ کہنے، سمجھانے اور ضد کرنے پر بھی فریحہ سے تعلق نہیں توڑ سکتی تھی۔

شاید اس لیے بھی کہ فریحہ کے ساتھ چلنے میں ماہ رو کے کسی جذبے کی تسکین ہوتی تھی اور اس وقت ویٹر کی نگاہوں میں ایک ستائش بڑھتی دیکھ کر فریحہ کو اسے ٹھوکا دینا ہی پڑا تھا۔ اور وہ جو دل ہی دل میں ماہم کو یاد کر رہی تھی۔ لمحہ بھر کے لیے چونک گئی۔

"ماہ رو! جلدی کرو۔ ہمیں گھر بھی جانا ہے۔" فریحہ نے باقی تینوں کے دل کی آواز بھی اس کے کانوں تک پہنچائی تھی۔ ماہ رو کو سنبھلنا ہی پڑا۔ پھر اس نے کڑی نگاہ سے ویٹر کو گھور کر آرڈر دیا تو سب کی جان میں جیسے جان آگئی تھی۔ اور ادھر فریحہ کو ایسے ہی ہول نہیں پڑ رہے تھے۔

فائیو اسٹار کی پچھلی جانب مشہور معروف رحمان پلازہ اس کے تایا اور ابا کی ذاتی ملکیت میں تھا۔ وہ خود تو ابا کی اکلوتی اولاد تھی تاہم تایا کے چھ کڑیل جوان بیٹے اسے ابا سے زیادہ اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے اور اس طرح تن تنہا ان کے خاندان کی کسی لڑکی کو بازار جانے کی اجازت تک نہیں تھی کجا کے کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں بیٹھ کر لنچ کرنا۔ فریحہ کو ایئر کنڈیشنڈ ماحول میں پسینے آرہے تھے اور وہ دعا کر رہی تھی کہ کسی تایا زاد کی نگاہ کے "گھیر" میں نہ آجائے کیونکہ کبھی کبھار گھر سے لنچ منگوانے کی بجائے وہ لوگ اسی ہوٹل سے کھانا منگوا کر کھالیا کرتے تھے۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو قیامت آجانے کا خطرہ تھا۔

ویسے بھی فریحہ خاندان کی پہلی لڑکی تھی جس نے مخلوط تعلیمی ادارے میں تعلیم حاصل کی تھی۔ ورنہ تو باقی سب ڈگری کالج برائے خواتین سے ہی پڑھ لکھ کر شادی شدہ ہو جاتیں۔ سوائے فریحہ کے کوئی جاب بھی نہیں کرتی تھی۔ کیونکہ تایا اور ابا کو پسند نہیں تھا۔ ویسے بھی گھر میں خوش حالی تھی۔ تایا اور ابا کا کلاتھ ڈپو تھا۔ گارمنٹس کی دکان تھی۔ ہوزری کا ہول سیل کا کاروبار تھا۔ کاسمیٹکس' الیکٹرونکس اور کراکری میں ہر قسم کی ورائٹی رحمان پلازہ میں موجود تھی۔

سارا کاروبار تایا' ابا اور تایا کے چھ بیٹے سنبھال رہے تھے۔ عورتیں گھروں تک محدود تھیں اور خوش و خرم زندگی گزار رہی تھیں۔ بظاہر کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ پھر بھی فریحہ کو اپنی حدود و قیود کا بڑا خیال رہتا تھا۔

اور وہ جانتی تھی کہ کون سی بات اس کے خاندان میں مردوں کو بری لگتی ہے۔ اس کا دل بھی سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ جبکہ فریحہ کے خوف سے انجان اس کی باقی دوستیں کھانے پہ اس طرح سے ٹوٹ رہی تھیں۔ جیسے زندگی میں پہلی مرتبہ اچھا کھانا دیکھنا نصیب ہوا تھا۔

اور شاید ماہ رو کے تاثرات بھی کچھ ایسے تھے۔ اسی لیے ماہ رو نے کھانے سے جلدی ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ پھر اپنی باقی دوستوں کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

"کھانے کے بعد ایک چکر رحمان پلازہ کا لگالیں گے۔ دیکھو' بار بار بازار آنا ممکن نہیں۔ پھر ماہ رو بھی کبھی کبھار ملتی ہے۔ آج تو ماہ رو کی کار میں سامان رکھ کر با آسانی گھر چلے جائیں گے پھر تو رکشوں میں خوار ہونا پڑے گا۔" سمیرا نے اپنے تئیں بڑی فائدہ مند بات کی تھی۔ باقیوں نے بھی اتفاق کر لیا تھا۔ ماہ رو گو کہ شکل سے اب بے زار لگ رہی تھی پھر بھی کچھ نہ کچھ مروت دکھادیتی تھی۔ پھر فریحہ تو چاہتی تھی کہ ماہ رو آج تو مروت نہ ہی دکھائے۔ اور انہیں اٹھا کر کار میں ٹھونس دے۔ کیونکہ وہ جلد از جلد گھر جانا چاہتی تھی۔ رہا گفٹس کا سوال تو فریحہ ابا سے کہتی تو وہ اعلا سے اعلا کپڑا گھر میں اٹھا کر لے آتے۔ بازار آنے کی ضرورت کبھی نہ پڑتی۔ لیکن یہ ماہ رو بھی نا۔ اگر وہ زبردستی فریحہ کو نہ گھسیٹتی تو فریحہ ان باقیوں کو آرام سے انکار کر سکتی تھی۔ اور اب ماہ رو کے ساتھ آکر فریحہ سخت پچھتا رہی تھی۔ کیونکہ ماہ رو نے سمیرا اور ہما کی بات نہ صرف مان لی تھی بلکہ بل پے کر کے اٹھ بھی گئی۔ لیکن اٹھتے ہوئے اس نے وارننگ ضرور دی تھی۔

"اب زیادہ دیر کی تو سر پھاڑ دوں گی۔ بارگیننگ مجھے سخت بری لگتی ہے۔ اس لیے تو میں ایسی عام دکانوں پہ جاتی نہیں۔ تم لوگوں کی خاطر اس بھری دوپہر میں دکان داروں اور کسٹمرز کی بک بک سننا پڑے گی۔" اس نے احسان جتاتے ہوئے اپنا قیمتی پرس ہاتھ میں پکڑا اور برائے نام دوپٹے کو گلے میں برابر کرتی اٹھ گئی تھی۔ اس کے خوب صورت دودھیا بازو آنکھوں میں روشنی سے بھر رہے تھے۔ آستینیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ یوں شرٹ کے نیچے ٹائٹس پہن رکھی تھی۔ اور اپنے کھلے حسین لمبے بالوں کو اونچی پونی میں سمیٹ کر وہ رحمان پلازہ میں جانے کے لیے تیار تھی۔

رحمان پلازہ میں ماہ رو جیسی الٹرا ماڈ قسم کی مخلوق کا جانا نہ ہونے کے برابر تھا۔ اور اگر ابا' تایا نے دیکھ لیا۔ دیکھ تو انہوں نے لینا ہی تھا۔ فریحہ کو جیسے پھر سے ہول پڑنے لگے تھے۔

وہ سن ہوتے دماغ کے ساتھ چل رہی تھی۔ ایسے

ہی ہوٹل سے نکلتے ہوئے فریحہ کو لگا تھا کہ کوئی اسے بہت غور سے دیکھ رہا ہے۔ حالانکہ دیکھنے کی چیز تو ماہ رو تھی۔ اور لوگ مڑ مڑ کر ماہ رو کو دیکھ بھی رہے تھے۔ پھر یہ چبھتی چبھتی سی آنکھیں کسی کی تھیں؟ کون تھا جو غصے بھری آنکھوں سے دیکھ رہا تھا؟ اس کا دل گھبرا گیا وہ دل میں اور بھی خوف بھرے ماہ رو کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔

سعدیہ 'ہما اور سمیرا تو مناسب قیمتوں پہ کمپرومائز کر کے ایک ایک بیگ' پرس' بچوں کی جوتیاں' اسٹیشنزی وغیرہ خرید چکی تھیں۔

اب انہیں اس حصے کی طرف جانا تھا جہاں کلاتھ ڈپو کی پورے شہر سے زیادہ اچھی اور سستی ورائٹی ملتی تھی۔ وہاں ۔ کاؤنٹر پہ ہی تایا دکھائی دے گئے تھے۔ شاید ابھی ابھی نماز ظہر ادا کی تھی۔ ہاتھ میں تسبیح تھی۔ یقیناً" کاروبار میں خیروبرکت کی دعا اور کوئی وظیفہ پڑھ رہے تھے۔

ان سے کچھ فاصلے پر ابا بھی گاہکوں سے نبٹ رہے تھے۔

کلاتھ ڈپو کی طرف تایا زاد کم کم ہی آتے تھے۔ فی الحال تو کوئی بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ زیادہ تر اوپر ہوتے۔ جہاں پہ الیکٹرونکس کا انتہائی اعلا سامان' موبائل ایجنسی' اور لیپ ٹاپ کمپیوٹر وغیرہ ملتے تھے۔ فریحہ نے دل ہی دل میں شکریہ ادا کیا۔ اور ایک چور نگاہ ماہ رو پہ ڈالی تھی۔ وہ انتہائی بے زار کھڑی تھی۔ اور سمیرا' ہما کے فارغ ہونے کا انتظار کر رہی تھی جو سیل بوائز سے بھاؤ تاؤ میں مصروف تھیں۔

معاً" ابا اور تایا' نے چہرہ چھپائے کھڑی فریحہ کو دیکھ لیا۔ دونوں پہلے تو بہت حیران ہوئے تھے پھر پہچانتے ہوئے قریب آگئے۔ دونوں کے چہروں کا استعجاب فریحہ کو سخت شرمندہ کر رہا تھا۔

"فریحہ بیٹا! تم یہاں؟ خیریت تو ہے؟ کیوں آئی ہو؟ کچھ چاہیے تھا تو فون کر دیتیں۔" تایا نے ہی گفتگو میں پہل کی تھی۔ ان کا انداز نرم تھا۔ فریحہ کو ڈھارس سی پہنچی تھی۔ دل میں سکون سا اترا تھا۔ تایا اور ابا کے تاثرات نرم تھے۔ اور ابھی وہ اپنے آنے کی تفصیل بتانا چاہتی تھی کہ اچانک سے مردانہ آواز ابھری تھی۔

فریحہ کا دل اچھل کر حلق میں آگیا تھا۔ سینے میں یوں دھماکا ہوا جیسے کوئی بم پھٹا ہو۔ خوف کے مارے اسے جھرجھری آگئی تھی۔ اس کے پیچھے عباس کھڑا تھا۔ عون عباس۔ فریحہ کا حلق تک سوکھ گیا تھا۔

"فون پہ بتا دیتی تو ہوٹلنگ کا لطف کیسے لیا جاتا۔؟"

اس کا انداز بہت سخت اور آواز بے انتہا مدہم تھی۔ یوں کہ تایا اور ابا نے تو سن لیا تاہم فاصلے پر موجود ماہ رو کچھ محروم رہ گئی تھی۔ لیکن اتنا تو وہ جان رہی تھی کہ آنے والے اس نوجوان نے فریحہ پر غصہ کیا ہے۔ اس نے کیا کہا تھا۔ یہ ماہ رو نہیں سن سکتی تھی۔ کیونکہ آنے والے جوان کی پرسنالٹی اور وجاہت دیکھ کر اس کی حسین آنکھوں میں تحیر در آیا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک اور اس نوجوان سے ملتے نقوش والا جوان بھی پہنچ گیا۔ جس نے فریحہ کی وکالت کی تھی۔ اور اسے ڈانٹ سے بچانے کی کوشش کی تھی۔ ماہ رو کا تو سانس رک گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ الجھن بھی بھری۔ یہ چہرہ کچھ دیکھا بھالا لگتا تھا۔

"کیا دکان دار اتنے خوب صورت ہوتے ہیں؟" ماہ رو کے لب بے آواز پھڑپھڑائے تھے۔ وہ ساکت آنکھوں سے دیکھتی رہی تھی۔ اس کی سماعتیں جیسے بہری ہو رہی تھیں۔ حالانکہ آوازیں اب نسبتاً" بلند تھیں۔ اور فریحہ خفا خفا انداز میں وضاحت دے رہی تھی۔

"میری دوستوں کو ڈسکاؤنٹ پہ کپڑا چاہیے تھا۔ اس لیے ساتھ آئی ہوں۔ مجھے یہاں آنے کا کچھ شوق نہیں تھا۔" فریحہ کی وضاحت پہ تایا اور ابا نے عباس نامی جوان کو ڈپٹ کر چپ کروا دیا تھا۔ جو کہ فریحہ کو کچھ اور سخت سست سنانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ باپ اور چچا کے کچھ بولنے پر وہ خاموش ہو کر پلٹ گیا تھا۔ اس کے جاتے ہی جیسے سارے منظر پھیکے پڑ گئے تھے۔ کچھ دیر پہلے تک ہال میں بھانت بھانت کا شور تھا جو عون عباس کے آتے ہی پس منظر میں چلا گیا تھا۔ یوں لگا' جیسے وقت کی نبض تھم گئی تھی۔ اس کی رنگت غیر معمولی

حد تک سرخ ہو چکی تھی۔ نرم دودھیا رخسار گیلے اور نم تھے۔ قطرہ قطرہ پسینہ جیسے پھسل رہا تھا۔

اس کی طرف دیکھتے ہوئے جیسے ہی فریحہ نے تایا اور ابا کو متوجہ کیا گویا وہ اس کا تعارف کروا رہی تھی۔ معا" وہ کچھ چونک سی گئی۔ ابا اور تایا نے آگے بڑھ کر ماہ رو کو خود سر پر پیار سے ہاتھ رکھا تھا۔ جبکہ ماہ رو کسی چینی کے بے ساکت مجسمے کی طرح ساکت کھڑی تھی۔ اتنی ساکت کے تایا اور ابا کے پیار کرنے پر بھی چونکی نہیں تھی۔

فریحہ کو اس کا انداز بڑا غیر معمولی اور عجیب لگا تھا۔ جبکہ ابا اور تایا کچھ متفکر ہو گئے تھے۔

"فریحہ بیٹا! تمہاری دوست کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔" ان کی پریشانی اور تفکر کو دیکھ کر شاید ماہ رو بھی کچھ سنبھل گئی تھی۔ پھر فریحہ اور سمیرا بھی متوجہ ہو گئی تھیں۔ ماہ رو کی طرف دیکھا اور آرام سے بولیں۔

"انکل! ماہ رو بڑی نازک مزاج ہے۔ اتنی گرمی برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ تو ہمارے لیے خوار ہو رہی ہے۔ ورنہ اب تک جا چکی ہوتی۔"

"ارے یہ تو ہے۔" ابا اور تایا نے ایسے سہلایا گویا واقعی جانتے تھے کہ ماہ رو گرمی کی شدت برداشت نہیں کر پا رہی۔ اور یہ جو اتنا ہجوم تھا؟ عورتیں، بچے، خواتین، لڑکیاں، بوڑھیاں یہ بھی تو۔؟ لیکن یہ سب ماہ رو جیسی تو نہیں تھیں نا۔ ماہ رو تو ان سب میں الگ اور ممتاز نظر آ رہی تھی۔ بہت مختلف اور بہت منفرد۔ نہایت دلنشین، خوب صورت اور نازک اندام۔ جو گرمی جیسی تکلیف کو بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

اور ماہ رو کی کیفیات یکسر الگ تھیں۔ وہ اختیار رکھتی تو عمر بھر یہیں کھڑی رہتی۔ کبھی پلٹتی نا۔ عمر بھر کے لیے اسی موڑ پر کھڑی رہتی۔

ادھر فریحہ کے تایا اور ابا ان کے لیے جوس وغیرہ منگوا رہے تھے۔ اور ماہ رو کی خرابی طبیعت کو دیکھ کر چاہ رہے تھے کہ وہ اوپر آفس میں چلی جائیں۔ وہاں اے سی لگا ہوا تھا۔ اور آرام سے وہاں بیٹھ کر جوس پی لیں۔

لیکن یہاں سعدیہ اور ہما نے ٹانگ اڑا لی تھی۔ انہیں گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ چونکہ بارعایت شاپنگ تمام ہو چکی تھی۔ سو انہیں گھر میں موجود اپنے بچوں کا خیال ستا رہا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ماہ رو کو ان سب کی پیروی کرنا پڑی تھی۔

پھر پورا راستہ وہ ایسے ہی گم صم اور خاموش رہی۔ گو کہ وہ اپنے دل کے خالی پن کو اور اپنی اندرونی طور پر ہونے والی تمام تبدیلیوں کو سمجھ رہی تھی۔ پھر بھی دل پہ ہونے والی یہ اچانک واردات ایسی معمولی نہیں تھی جو وہ اپنے تاثرات باقی سب سے چھپا سکتی۔

سعدیہ، ہما وغیرہ کو ان کے اسٹاپ اور گھروں کے قریب ڈراپ کرنے کے بعد جب فریحہ کی باری آئی تو فریحہ نے خود ہی شائستگی سے ماہ رو کو مخاطب کر لیا۔

"مجھے بھی اسٹاپ پر اتار دو۔ میرا گھر قریب ہے۔ پیدل چلی جاؤں گی۔" فریحہ کے الفاظ پہ ماہ رو ذرا چونک گئی تھی۔ پھر اس نے جیسے خود کو سنبھال کر نرمی سے کہا۔

"میں تمہیں گھر تک ڈراپ کر دوں گی۔ اس اسٹاپ تک تو تمہیں کئی مرتبہ چھوڑ چکی ہوں۔ ویسے اتنی پرانی دوستی کے باوجود ہم لوگ کبھی ایک دوسرے کے گھر نہیں آئی ہیں۔ کتنی حیران کن بات ہے۔ تم نے بھی مجھے کبھی بلایا نہیں۔" ماہ رو نے بلا ارادہ ہی شکوہ کر دیا تھا۔ اس کے شکوے پہ فریحہ چونک گئی تھی۔ پھر جیسے جتلا کر بولی۔

"کیوں نہیں بلایا۔ میں نے قاسم اور عاصم بھائی کی شادی پہ بھی تمہیں انوائٹ کیا تھا۔ کائنات کی سالگرہ پہ بھی۔ عاصم بھائی کے بیٹے کا عقیقہ کیا تب بھی تمہیں انوائٹ کیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ تم اسٹاپ تک اکثر ڈراپ کر دیتی تھیں مگر گھر پہ کبھی نہیں آئیں۔" فریحہ کے صاف الفاظ میں جتلانے پہ ماہ رو کچھ جز بز ضرور ہو گئی تھی۔ اسے واقعی وہ تمام مواقع یاد آ چکے تھے جب فریحہ نے اسے اپنے گھر میں آنے کی دعوت دی تھی۔ تاہم ہر دفعہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے ماہ رو دوسرے سے غائب ہو جاتی تھی۔ کیونکہ بقول ماہم کے وہ ایسے بے

کار اور پینڈو فنکشن میں شریک ہو کر اپنا وقت ضائع نہ ہی کرے تو بہتر تھا۔ اور آج ماہ رو کو وہ سارے اچھے مواقع کھو دینے پہ دکھ اور افسوس ہو رہا تھا۔ ماہ رو کے اندر ڈھیر سارا زیاں اتر آیا تھا۔ رہ رہ کر وہی دلنشین منظر نگاہوں کے پار اتر جاتا۔

وہی خوب صورت آواز اور مغرور نقوش والا شاندار ساعون عباس۔ ایک معمولی ساہو کار' دکان دار' جس کی ایک جھلک نے ماہ رو کو زمان و مکان بھلا دیئے تھے۔ اور آج وہ زبردستی فریحہ کو اس کے گھر ڈراپ کرنے جا رہی تھی۔ اور شاید فریحہ اس کی تمام اندرونی کیفیات سے یکسر انجان تھی۔ تب ہی وہ ماہ رو کو گھر لے جانے پہ بے ساختہ خوش ہو گئی۔

"دیکھنا کائنات ثنا اور مریم بھابھی تمہیں دیکھ کر مسحور ہو جائیں گی۔ تمہارے حسن کی میں نے بہت تعریفیں کر رکھی ہیں۔" فریحہ کے سادگی بھرے الفاظ نے ماہ رو کو ہفت اقلیم جیسی دولت سے نواز دیا تھا۔ تو گویا فریحہ کے گھر میں اس کا غائبانہ تعارف ہو چکا تھا۔ وہاں ماہ رو اجنبی یا انجان خود کو نہیں سمجھے گی۔ اور فریحہ کے سفید ماربل سے سجے بڑے سے گھر کی بے انتہا راہداریوں میں چلتے ہوئے ماہ رو کو اندازہ ہو گیا تھا کہ فریحہ نے جو کہا تھا بالکل درست کہا تھا۔

ماہ رو کا وہاں غائبانہ ذکر ایک ہزار مرتبہ ہو چکا تھا۔ فریحہ کی بھابھیاں اور کائنات (تایا کی اکلوتی بیٹی) تو ماہ رو سے ایسے چپک کر بیٹھ گئی تھی جیسے عمر بھر ساتھ ہی رہنے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ وہ ماہ رو کو چھو چھو کر دیکھتی اور حیران ہوتی۔

"اللہ' ماہ رو آپی آپ کس قدر حسین ہیں۔ فریحہ آپی بالکل جھوٹ نہیں کہتی تھیں۔ آپ اپنی تصویروں سے زیادہ حسین ہیں۔" کائنات کے یہ الفاظ ماہ رو کو ہواؤں میں اڑا رہے تھے۔ وہ کسی شہزادی کی طرح ان سب کے درمیان بیٹھی تھی۔ فریحہ کی امی اور تائی بھی بہت مہربان خواتین تھیں۔ انہوں نے بھی ماہ رو کو ملکاؤں جیسا پروٹوکول دیا تھا۔ اور جاتے سمے فریحہ کی تائی نے اسے بہت نفیس جوڑا دیا۔ یہ جوڑا ماہ رو کو کسی ڈیزائنر کے جوڑے سے بھی زیادہ قیمتی اور نفیس لگا تھا۔ پھر ان سب کے پیار نے ماہ رو کے اندر گڑی تنہائی اور اکیلے پن کو اکھاڑ پھینکا تھا۔ وہ اپنا دل تو فریحہ کی تائی کے لخت جگر کو دے آئی تھی۔ اپنی روح بھی "رحمان منزل" کی راہداریوں میں ہمیشہ کے لیے چھوڑ آئی۔ کیونکہ ماہ رو سرفراز کو ایک معمولی دکان دار کے بیٹے سے محبت ہو گئی تھی۔



فریحہ کا تعلق گو کہ ایک خوش حال گھرانے سے تھا۔ جہاں تنگی یا رزق کی کمی کبھی دکھائی نہیں دی تھی۔ تایا رحمان اور اس کے ابا کا اکٹھا کاروبار تھا۔ جو اب تایا کے بیٹوں نے سنبھال رکھا تھا۔ ابا اور تایا بھی برابر ان کا ساتھ دیتے تھے۔

رحمان پلازہ میں ان کی چلتی دکان داری سے کبھی تنگی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ پھر ان کا خاندان مشترکہ نظام کے تحت چل رہا تھا۔ جوائنٹ فیملی سسٹم کے تحت وہ بخوشی ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے۔ یہ ایسا گھرانہ تھا جہاں روایات' اقدار اور جذبات کی قدر کرنے والے بہت تھے۔ سو اسی پیمانے پر ان سب کی تربیت کی گئی تھی۔

تایا رحمان کے چھ بیٹے تھے۔ عاصم' قاسم کی دو سال پہلے شادیاں ہو چکی تھیں۔ خوش قسمتی سے دونوں کی بیویاں بھی بہت اچھی تھیں۔ سو گھر کا ماحول ہمیشہ سازگار رہتا تھا۔

عاصم اور قاسم کے بعد عون اور عاشر تھے۔ پھر عامر اور یاسر تھے۔ جو کالج میں زیر تعلیم تھے۔ کائنات سب سے چھوٹی تھی اور حال ہی میں اس کا بھی سپیریئر کالج میں داخلہ ہوا تھا۔

فریحہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اور بچپن سے ہی تایا رحمان نے اسے اپنی بیٹی بنا لیا تھا۔ چونکہ ابا کی کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی اس لیے فریحہ کو ہمیشہ اس گھر میں رہنا تھا۔ سو' فریحہ کے والدین اپنی اکلوتی بیٹی کے مستقبل کے لیے قطعاً" پریشان نہیں تھے۔

ایک ماہ پہلے اس نے گھر میں اپنی جاب کا شوشا چھوڑا تب کوئی بھی اس کی نوکری کے حق میں نہیں تھا۔ لیکن تایا اس کی خواہش جان کر محض اس شرط پہ راضی ہوئے تھے کہ شادی سے پہلے وہ اپنا شوق پورا کر سکتی ہے۔ کیونکہ دو تین مہینے کے اندر اندر فریحہ کی شادی بھی متوقع تھی۔

اس کی جاب پہ سب سے زیادہ مخالفت عون عباس نے کی تھی۔ بلکہ وہ تو پورا ہفتہ اس بات پہ ناراض بھی رہا تھا۔ اپنے تمام تر اکھڑ مزاج' رویے اور غصہ ور ہونے کے باوجود اس گھر میں اگر فریحہ کی کسی کے ساتھ دوستی تھی تو وہ صرف اور صرف عون عباس ہی تھا۔ دوستانہ بے تکلفی کے باوجود فریحہ عون سے کچھ کچھ ڈرتی بھی تھی۔ جیسے ہی وہ کسی بات پہ اڑ جاتا فریحہ خود بخود ہتھیار پھینک دیتی تھی۔

گھر میں فریحہ پہ سب سے زیادہ روک ٹوک بھی عون ہی کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ماہ رو سے بہت پرانی دوستی کے باوجود فریحہ کبھی اس کے گھر نہیں گئی تھی۔ ایک تو ماہ رو کا اسٹیٹس میچ نہیں کرتا تھا پھر وہ آزاد ماحول کی باسی تھی۔ شاید کوئی بھی فریحہ کو ماہ رو کے گھر جانے کی اجازت نہ دیتا۔ لیکن ایسی نوبت آئی بھی کبھی نہیں تھی۔ ماہ رو نے کبھی بھی فریحہ کو اپنے گھر انوائٹ نہیں کیا تھا۔ نہ کسی سالگرہ پہ نہ کسی فنکشن میں۔

ماہم کے توسط سے فریحہ تک ماہ رو کی ہر پارٹی کی اطلاع تو ضرور پہنچ جاتی تھی۔ اور وہ جانتی بھی تھی کہ ماہ رو اسے جان بوجھ کر نہیں بلاتی۔ لیکن فریحہ نے کبھی شکوہ بھی نہیں کیا تھا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی اسے ماہ رو کے گھر جانے کی کبھی اجازت نہ ملتی۔

اس دن اتوار تھا۔ کالج اور اسکولز کے ساتھ 'ابا تایا' دکانیں بھی بند کرتے تھے۔ اتوار کے اتوار حساب بھی کرنا ہوتا تھا اور نیا مال بھی خریدنا ہوتا۔ اس لیے اتوار کو چھٹی ہوتی تھی اور خواتین کی مصروفیت بھی بڑھ جاتی تھی۔ سب مرد اتوار کو گھر پر ہوتے تھے۔ سارا دن کچن میں ہی گزر جاتا تھا۔ اور آج فریحہ 'ابا اور عون کی پسند کا کھانا بنا رہی تھی۔ اچاری بریانی کے ساتھ بالٹی کنا نہاری جیسی محنت طلب ڈشز بناتے ہوئے فریحہ کو دانتوں پسینہ آگیا تھا۔ چونکہ موسم بھی گرم تھا اس لیے آج کچھ زیادہ ہی گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ ابھی وہ اچاری بریانی کو دم دے ہی رہی تھی جب کائنات نے اونچی آواز میں اسے اطلاع دی تھی۔

"فری آپی! آپ کی فرینڈ کا فون ہے۔"

"کس کا فون ہے کائنات؟" فریحہ کا انداز مصروف سا تھا۔ کیونکہ عموماً" اس کی فرینڈز گھر میں کالز وغیرہ نہیں کرتی تھیں۔ وہ اندازہ لگاتی ہوئی کچن سے باہر آئی تھی۔ "کس کا فون ہو سکتا ہے؟ ہما' سعدیہ 'سمیرا!۔

"ماہ رو آپی کا۔ جو اس دن آپ کو چھوڑنے ہمارے گھر آئی تھیں۔" اپنی حیرت کا گلا دبا کر اس نے فون اٹھالیا۔ دوسری طرف واقعی ہی ماہ رو کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔ ماہ رو نے اسے کال کی تھی۔ از خود؟ فریحہ کو یقین ہی نہیں آیا تھا۔ اتنی لمبی دوستی میں ماہ رو نے دوسری یا تیسری مرتبہ بغیر کسی کام کے کال کی تھی ورنہ جب یونی ورسٹی میں تھیں تب اکثر نوٹس وغیرہ کے لیے وہ گھر میں کال کر لیا کرتی تھی۔ کبھی "دوستانے" کی خاطر اس نے کال نہیں کی تھی۔

"فریحہ! کیسی ہو تم؟" ماہ رو سے بات نہ بن پڑی تو بے تکا سا سوال کر دیا۔ فریحہ جو پہلے سے ماہ رو کے فون پہ حیران تھی کچھ اور بھی حیران رہ گئی۔

"ایک رات میں کیسی ہو سکتی ہوں؟ ابھی کل تو ہماری دوبارہ ملاقات ہوئی تھی۔" فریحہ نے اسے یاد دلانا چاہا تھا جب وہ ہفتے میں تیسری مرتبہ اس کے کالج ملنے چلی آئی تھی۔ اور یہ ملنا بے سبب ہی تھا۔ ماہ رو دس پندرہ منٹ کے لیے آئی اور چلی بھی گئی تھی۔ فریحہ کو وہ خاصی مضطرب لگی تھی نجانے کیا معاملہ تھا۔ ماہ رو کا چہرہ پہلے سا فریش بھی نہیں تھا۔ بجھا بجھا سا اداس تھا۔ جیسے وہ کسی الجھن میں تھی۔ فریحہ تب پوچھتی رہ گئی تھی تاہم ماہ رو نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ ماہ رو اب بھی کچھ نہیں بتا رہی تھی۔ نجانے معاملہ کیا تھا؟ اس نے خود ہی کال بھی ڈسکنکٹ کر دی تھی۔ فریحہ جیسے حیران رہ گئی۔ ابھی وہ اس حیرت سے سنبھلی نہیں تھی جب

لاؤنج میں چھڑے موضوع کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ وہاں تو ایک اور ہی بحث کا سماں تھا۔ فریحہ کو فون بند کرتے دیکھ کر عامر اور یاسر نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔

"فریحہ آپی! آپ کی اتنی حسین دوست ہے۔ اور آپ کے بھائی کسی ایلو سے کم نہیں۔ ہمارا "چانس" بنوا دو۔ ماہ رو کو اپنی بھابھی بنالو۔ میں آج ہی دولہا بننے کو تیار ہوں۔" یاسر نے اس قدر اتاؤلے پن سے کہا تھا کہ پاس بیٹھی تائی نے جوتا اتار کر اس کی کمر کا خوب نشانہ لیا۔

"ابھی سیکنڈ ایئر میں پاس ہو کر تو دکھاؤ۔ پھر کسی کے سر تاج بھی بن جانا۔" یہ کھرا کھرا جواب عون کی طرف سے آیا تھا۔ یاسر ڈھٹائی سے ہنستا رہا۔

"پڑھی لکھی بیوی لاؤں گا تو خود پڑھا دے گی۔ ٹیوشن کی بچت کے ساتھ مفت میں فری اکیڈمی کا مزہ بھی لوں گا۔"

"اور وہ کما کر لائے گی تم آرام سے بیٹھ کر کھانا۔" عامر نے بھی لقمہ دینا ضروری سمجھا تھا۔ یاسر کو اس کے لبوں سے نکلی بات دل کو لگی تھی۔

"میرا فیوچر میں یہی پلان ہے۔" اس نے شان بے نیازی سے کہا۔

"مجھ سے بھائیوں کی طرح دکان داری نہیں ہوتی۔ اور نہ میں بھانت بھانت کی خرانٹ عورتوں کے ساتھ مغز ماری کر سکتا ہوں۔ میں اپنے خاندانی بزنس کو اپنے لیے قطعاً "غیر مناسب سمجھتا ہوں"۔" موضوع گفتگو کسی اور سمت کو جانکلا تھا۔ عون حساب کرتے ہوئے بار بار ڈسٹرب ہو رہا تھا اس وقت بھائیوں کی "چونچالی" خاصی گڑبڑ مچا رہی تھی۔

اوپر سے کائنات کا ماہ رونامہ۔ وہ فریحہ کی اس ماڈرن کسی حد تک بے باک دوست سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہو چکی تھی۔ وہی ماہ رو جسے فریحہ کے ساتھ دیکھ کر عون کو خاصا اچنبھا ہوا تھا۔ کہاں فریحہ اور کہاں ماہ رو۔ فریحہ ڈھکی چھپی کم گو سنجیدہ اور باوقار سی لڑکی۔ ماہ رو انتہائی لبرل "ماڈ" بے باک اور شوخ طبیعت کی۔ عون نے ایک اچٹتی نگاہ اس پہ ڈالی تھی۔ اور اس نگاہ میں وہ ماہ رو کا مکمل جائزہ لے چکا تھا۔ وہ کسی بھی لحاظ سے فریحہ کی دوست کے پیمانے پہ پوری نہیں اتر سکتی تھی۔ اور وہ سوچ رہا تھا کہ فریحہ کو اس لڑکی سے میل ملاپ رکھنے دوستی بڑھانے سے منع کر دے گا۔ کیونکہ اس لڑکی کا اسٹیٹس، رہن سہن، انداز و اطوار ان کے گھرانے کے کسی لڑکی کو متاثر کرنے کے قابل نہیں تھے۔

پہلی نگاہ میں ہی عون کو وہ ناپسندیدہ لگی تھی۔ تب وہ فریحہ کے لیے خاموش ہو گیا تھا۔ مگر جب اگلے ہی دن پھر ماہ رو کی عین ناشتے کے وقت کال آگئی۔ اور یہ بھی ایک انوکھا سا واقعہ تھا۔ فریحہ ایک مرتبہ پھر شاکڈ رہ گئی تھی۔ کیونکہ اس ہفتے میں ماہ رو کی یہ کوئی اٹھارویں کال تھی۔ وہ شاید اگلے پچھلے ریکارڈ توڑنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ یہ کال پہلی کالز کی طرح بے مقصد نہیں تھی۔ اس دفعہ ماہ رو نے فریحہ کو اپنے گھر انوائٹ کیا تھا۔ بقول ماہ رو کے چھوٹی سی برتھ ڈے پارٹی ارینج کر رہی تھی۔ سو فریحہ کو پہلا دعوت نامہ مل گیا تھا۔ اور فریحہ فون رکھ کر بھی اتنی حیران تھی کہ کچھ دیر تک بول نہیں پائی تھی۔ کیا ماہ رو کی برتھ ڈے سال میں دو دو مرتبہ منائی جاتی تھی۔؟ اور شاید امیر لوگ اپنی سالگرہ سال میں کسی بھی وقت منا سکتے تھے۔

فون بند ہوا۔ تو سوالوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی تھی۔ عامر، یاسر اور کائنات اس کے سر ہو چکے تھے۔

"ماہ رو آپی کیا کہہ رہی تھیں!" کائنات دسترخوان سے اٹھ کر اس کے قریب آگئی تھی۔ عامر اور یاسر کے کان بھی کھڑے تھے۔ وہ بھی ناشتا بھول گئے۔ تائی اور امی بھی فریحہ کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

"اس کی برتھ ڈے ہے امی! سب کو انوائٹ کر رہی تھی۔" فریحہ کا انداز کچھ مدھم تھا۔ پھر بھی تایا، ابا اور عون نے سر اٹھا کر دیکھا تھا۔

"سب کو۔۔۔" کائنات کا دل مچل اٹھا۔ "ہم سب کو کیا؟ اف مائی گاڈ۔ میں تو ضرور جاؤں گی۔ ہمارے گھر تو سالگرہ کا کوئی رواج نہیں ہے۔ ایک اچھی سی پارٹی اٹینڈ کرنے کا میرا دیرینہ شوق ہے۔" کائنات نے فرط

اشتیاق میں اتنی بلند آواز میں سب کو ڈھول پیٹ کر بتادیا تھا۔ یوں کہ ابا اور تایا بھی چونک گئے تھے۔ عون نے بھی چائے کا کپ ساسر میں رکھ دیا تھا۔ پھر وہ دسترخوان سے اٹھ گیا۔ شاید وہ ماہ رو نامے سے چڑ گیا تھا۔

امی اور تائی سوچ میں پڑ گئی تھیں۔ گو کہ فریحہ کی دوست انہیں دل سے پسند آئی تھی۔ پھر بھی اس کے گھر جانے میں وہ تذبذب کا شکار تھیں۔ تایا اور ابا یقیناً" رکاوٹ نہ ڈالتے۔ لیکن دونوں خواتین از خود ساری حدود و قیود کی پاسداری کیا کرتی تھیں۔

"فریحہ آپی! آپ ماہ رو آپی کو بتادیتی نا۔ ہم آج شام کو ان کے گھر جائیں گے۔ آخر وہ آپ کی اتنی پرانی فرینڈ ہیں۔" کائنات نے ایک مرتبہ پھر مچل کر کہا تھا۔ فریحہ امی اور تائی کی طرف دیکھنے لگی تھی جیسے جاننا چاہتی تھی کہ ان کی رائے کیا ہے؟ لیکن ان دونوں سے پہلے ہی عون بولتا ہوا دوبارہ اندر آگیا تھا۔

"کوئی ضرورت نہیں جانے کی۔ تم معذرت کرلو، اس کی پارٹیاں بھی اس کی طرح ہوں گی۔" اس نے بمشکل "اوور" اور "بے ہودہ" کہنے سے خود کو باز رکھا تھا۔ کائنات کا منہ اتر گیا تھا۔ فریحہ تاہم کچھ مطمئن ہوگئی تھی۔ جیسے عون نے اس کے دل کی بات کہہ ڈالی تھی۔

"وہ اتنے پیار سے بلارہی ہیں۔ اتنی پیاری تو ہیں ماہ رو آپی۔" کائنات منمناتی رہ گئی تھی۔

"ہم نے اس کے "پیار" کا اچار ڈالنا ہے۔" وہ کائنات کا سر سہلاتا ذرا مسکرا کر باہر نکل گیا تھا۔ دوسرے معنوں میں سب کو باور کروادیا تھا کہ ماہ رو کی دعوت پر آرام سے معذرت کرلیں۔ یوں ماہ رو کے انوی ٹیشن پر فریحہ سمیت کوئی بھی نہیں جاسکا تھا لیکن ہوا کچھ یوں کہ ماہ رو خود ہی اتنا بڑا شکوے کا دفتر اٹھا کر دوسرے ہی دن رحمان منزل ایک مرتبہ پھر اس انداز میں آئی کہ فریحہ کو اپنے اندر کچھ کھٹکتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ کھٹکتا ہوا احساس بھلا کیا تھا؟ ایک چٹکیاں بھرتا ہوا خیال، جیسے کچھ ہونے والا تھا۔ کوئی بچھڑنے والا تھا۔ اگلے بہت سارے دنوں میں فریحہ پہ یکے بعد دیگرے کچھ انکشاف ہوئے تھے۔ اور ان انکشافات نے اسے دم بخود کردیا تھا۔



لش گرین گھاس پہ ننگے پاؤں ٹہلتی وہ پچھلے کئی دنوں سے مضطرب تھی۔ اس اضطراب کا کوئی انت نہیں تھا۔ وہ ایسی تکلیف سے گزر رہی تھی جسکی لذت سے اسے پہلی مرتبہ آشنائی ہوئی تھی۔ یہ درد جولا دوا تھا اور جس کا کوئی علاج بھی نہیں تھا۔ وہ سمجھ نہیں پائی تھی کہ اس کے ساتھ ہو کیا رہا ہے؟ کیا چند لمحوں میں دل کی دنیا تہ و بالا ہو جاتی ہے؟ وہ سرفراز احمد جیسے معروف بزنس مین کی لاڈلی بیٹی نہ سہی اکلوتی ضرور تھی۔ اس کی پرورش ہائی سوسائٹی کے سارے اصولوں کے مطابق شاہانہ انداز میں ہوئی تھی۔ وہ ایک سال کی تھی جب ڈیڈی اور ممی میں علیحدگی ہوگئی تھی۔ پھر ممی نے اور شادی کرلی تھی ڈیڈی بھی اور بیوی لے آئے۔ شازمہ ڈیڈی کی من پسند بیوی ضرور تھی مگر ماہ رو کی کبھی ماں نہیں بن سکی تھی۔ ماہ رو مختلف آیاؤں کی گود میں پلتی ہوئی بچپن اور لڑکپن تک پہنچی تھی۔ اس دوران ماہ رو کے شعور نے پختگی حاصل کی تھی یا نہیں کی تھی تاہم وہ شازمہ کے ساتھ اپنے رشتے کی "نوعیت" خوب سمجھ گئی تھی۔

گو کہ ان کے تعلقات کبھی روایتی نہیں رہے تھے تاہم شازمہ نے کبھی اسے ایک ماں کا پیار یا توجہ نہیں دی تھی۔ شازمہ کا ایک بیٹا سنی تھا۔ جو شروع سے ہی ابراڈ رہا۔ سو ماہ رو کی اپنے بھائی سے بات چیت بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔ ڈیڈی بھی اپر کلاس کے ڈیڈیوں جیسے باپ تھے۔ کبھی ہفتوں بعد انہیں بیٹی کا خیال آتا تھا۔ البتہ روپے پیسے کی ماہ رو کو کبھی کمی نہیں رہی تھی۔ ڈیڈی یہ نہیں جانتے تھے کہ روپیہ سب کچھ نہیں ہوتا۔ والدین کی محبت، توجہ، خیال ایک نارمل بچے کی بنیاد بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، لیکن جہاں دونوں ہی رشتے مفقود ہوں وہاں تربیت، احساس،

خیال' توجہ یا محبت کہاں سے آتی؟ ماہ رو ایک ایسے تنہا پودے کی طرح پروان چڑھی تھی۔ جس کی بروقت کانٹ چھانٹ کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا تھا سو اس پودے میں کئی طرح سے جھاڑیاں کانٹے اور ابھی شاخیں نکل آئی تھیں۔ اکچوئلی ماہ رو کی پوری شخصیت اسی پودے سے امیجن کرتی تھی۔ جس میں کئی طرح سے نوک دار' بے وضع شاخیں اور کانٹے اگ آئے تھے۔

وہ باپ کی بے توجہی' عدم تحفظ اور لاپرواہی کے باعث بہت اکیلی' تنہا اور اداس تو تھی ہی' مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنی بے رنگ' ایب نارمل زندگی کی وجہ سے' بہت خود سر' نڈر' ضدی اور نک چڑھی بھی ہوتی گئی تھی جیسے جیسے عمر رواں کے سال آگے بڑھتے گئے وہ اپنے باپ اور ماں سے مزید دور ہوتی گئی تھی۔

اس نے روایتی اسٹیپ مدرز کی طرح کبھی ماہ رو پہ بے جا تشدد نہیں کیا تھا تاہم وہ بڑے مہذب طریقے اسے نفسیاتی طور پہ ٹارچر کیا کرتی تھی۔

چونکہ شازمہ اس کی اسٹیپ مدر تھی سو جلد ہی ماہ رو نے اس کے مبہم برے رویوں کو نظر انداز کرنا شروع کردیا تھا۔ وہ ڈیڈی کی لاپرواہی پہ کڑھنا بھی چھوڑ چکی تھی۔ شازمہ جو بھی کرتی ماہ رو کی بلا سے۔ کیونکہ جیسے ہی وہ بڑی ہوتی گئی تھی اس نے گھر سے باہر اپنے لیے ایکٹیوٹیز ڈھونڈلی تھیں۔ وہ کلب جاتی تھی' ہوٹلنگ کرتی' شاپنگ کرتی جب دل چاہتا دبئی' کینیڈا یا یو کے چلی جاتی۔ ڈیڈی کی طرف سے اس پہ کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ اسے کھلا جیب خرچ دیتے تھے اور مڑ کر کبھی حساب بھی نہیں لیتے تھے۔ پڑھائی میں بھی وہ خود بخود اچھی ہوگئی تھی۔ پھر ماہ رو نے اپنے سوشل سرکل کو بھی خاصا وسیع کرلیا تھا۔ پہلے پہل اس کی ایک ہی فرینڈ تھی۔ فریحہ' جو تھی تو مڈل کلاس سے تاہم اس کے پیرنٹس اسے اچھے اسکولز میں پڑھا رہے تھے۔ فریحہ اور ماہ رو ایک ساتھ کالج اور یونی ورسٹی تک بھی گئی تھیں۔ فریحہ کی خاطر ماہ رو نے اپنا کالج اور پھر یونی ورسٹی بھی چینج کرلی تھی۔

ان دونوں نے ایک ساتھ طویل دس سال گزارے تھے۔ اس کے باوجود دونوں میں بہت اعلا پائے کی دوستی نہیں ہوسکی تھی۔ اسٹیٹس ان دونوں کے درمیان ایک خلیج کی طرح حائل رہا تھا۔ شاید یہ دوستی بہت آگے تک نہ جاتی' لیکن اس کو کہیں نہ کہیں سے ماہ رو نے خود برقرار رکھا ہوا تھا۔ چونکہ فریحہ بہت ہی کم رو قسم کی سادہ مزاج لڑکی تھی اس لیے بھی ماہ رو کو اس کے ساتھ رہنا پسند تھا کیونکہ جہاں ماہ رو ہوتی تھی وہاں فریحہ پس منظر میں چلی جاتی تھی۔ اسی طرح فریحہ کو بھی ہمیشہ ماہ رو کی موجودگی میں بہت فائدے رہے تھے۔ پوری یونی ورسٹی میں ماہ رو کا طوطی بولتا تھا۔ کوئی اس کے حسن سے متاثر تھا' کوئی دولت سے۔ ماہ رو کی وجہ سے اکثر یونی ورسٹی فیلوز فریحہ کو بھی بہت خاص پروٹوکول دینے لگتی تھیں۔

ماہ رو میں بہت سی فطری اور بشری کمزوریاں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اور کچھ حالات نے اسے ذرا خود غرض بنادیا تھا۔

یہ ان ہی دنوں کی بات ہے جب ماہ رو نے یونی ورسٹی کو خیرباد کیا تھا۔ اور یہ بہت پرانا قصہ بھی نہیں تھا شاید سات یا آٹھ ماہ پہلے کی بات ہے۔ گوکہ ماہ رو کے دھڑا دھڑ پروپوزل آنا کوئی انوکھا واقعہ نہیں تھا۔ کیونکہ اس کی پرپوزلز کا ایک لمبا سلسلہ کالج لائف میں ہی شروع ہوگیا تھا۔ ہر کلاس سے رشتہ آتا تھا۔ ایلیٹ' اپر' مڈل' یوں تو ایک مرتبہ ڈیڈی تک دکھلائے گئے تھے کیونکہ انہوں ماہ رو کے لیے شادی وغیرہ کے جھنجٹ کو نہیں سوچا تھا۔ سو تمام پرپوزلز ریجیکٹ کردیے گئے تھے۔ ڈیڈی نے سب سے مہذب انداز میں معذرت کرلی تھی' لیکن وقاص کا رشتہ ایسا تھا جس پہ پہلی مرتبہ گھر میں سرد جنگ کا آغاز ہوگیا تھا۔

ڈیڈی کسی بھی صورت میں وقاص کے پرپوزل کو ریجیکٹ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ وقاص بہت لائق فائق تھا۔ اس نے بائیو ٹیکنالوجی میں امریکا سے پی ایچ ڈی کیا تھا۔ اس کی پوری فیملی گوکہ ڈیڈی کے ٹکر کی

نہیں تھی پھر بھی ذہانت، علم اور وضع داری میں ان کے گھرانے سے اچھا شاید ہی کوئی گھرانہ ہو۔ اور ماہ رو کو یہ بھی بہت بعد میں پتا چلا تھا کہ شازمہ کی بہن بذات خود اپنی بہن کو پسند نہیں کرتیں۔ شاید اس لیے کہ بہت سال پہلے ماہ رو کے ڈیڈی کی معمولی سیکریٹری سے "بیوی" تک کا عہدہ پانے میں شازمہ نے کبھی اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے خوابوں اور ارمانوں کا خون کیا تھا۔ ممی اور ڈیڈی کی علیحدگی کا سبب بھی شازمہ سرفراز ہی تھی

شازمہ کے بھانجے کاسن کر ماہ رو نے خود ہی دو ٹوک انکار کر دیا تھا۔ وہ شازمہ سے نفرت تو نہیں کرتی تھی تاہم اس سے اور اس کی فیملی سے بے زار ضرور تھی۔ یہ اور بات تھی کہ ماہ رو کا انکار شازمہ کے لیے بڑا شادمانی کا سبب بنا تھا۔ ماہ رو جو سمجھ رہی تھی اس کے انکار کو شازمہ اپنی توہین سمجھ کر سیخ پا ہو جائے گی اسے مطمئن دیکھ کر اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔ کیونکہ شازمہ نے بخوشی ماہ رو کا انکار اپنی بہن تک پہنچا دیا تھا۔ اور ڈیڈی جو وقاص کو دل و جان سے پسند کر چکے تھے۔ اس کی ذہانت، خوش مزاجی، شرافت، نجابت اور شاندار اکیڈمک ریکارڈ سے متاثر ہو چکے تھے۔ ان کے لیے یہ انکار دھچکے سے کم نہیں تھا۔ ڈیڈی نے پہلی مرتبہ ماہ رو پہ غصے ہونے کی بجائے شازمہ کو آڑھے ہاتھوں لیا تھا۔

"مجھ سے مشورہ کیے بغیر اپنی بہن تک انکار پہنچا دیا۔ تم نے اچھا نہیں کیا۔" ان کا غصہ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔ شازمہ چونکہ ڈنکے کی چوٹ پہ جھگڑے کرتی آئی تھی۔ اور ڈیڈی کبھی اس کے سامنے بولنے کی جرات نہیں کر سکے تھے۔ اس لیے وہ ایک مرتبہ پھر ڈیڈی پہ چڑھائی کرنے میں لگ گئی تھی۔

"تمہاری بیٹی نے خود انکار کیا ہے۔ وہ میرے رشتہ داروں میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔ تم بیٹی کے ساتھ زبردستی کرو گے؟ میرا کیا قصور ہے۔ میں نے تو آپی تک جواب پہنچا دیا۔" شازمہ نے ہار کہاں مانی تھی اور وہ خود پہ آنچ بھی نہیں آنے دے رہی تھی۔

"اگر تمہاری اپنی بیٹی ہوتی تم تب بھی یہی کرتیں؟ اسے سمجھانے یا رام کرنے کی بجائے متوقع سسرالیوں

تک اس کے "عیب" پہنچائیں؟ مجھے تو اب پتا چلا ہے۔ تم چاہتی ہی نہیں تھیں کہ وقاص جیسے قابل لڑکے سے ماہ رو کی شادی ہو۔" ڈیڈی کے اگلے الفاظ نے شازمہ کو شرمندہ کردیا۔ وہ ماہ رو کے لیے شازمہ سے اس لہجے میں کلام کررہے تھے؟ سو کچھ دیر کی کوشش کے بعد اس کا لہجہ رواں اور نارمل ہوگیا تھا۔

"ماہ رو کے لیے یہ کوئی آخری پرپوزل نہیں تھا۔ ابھی دنیا بھری پڑی ہے ویسے بھی تمہیں ماہ رو کے لیے اپنے سرکل تک محدود رہنا چاہیے۔ اپنی کلاس میں پرپوزل دیکھو...." شازمہ نے بڑی حد تک اپنے ابلتے غصے پہ بندھ باندھنے کے بعد ذرا دھیمی آواز میں کہا تھا۔

"میری کلاس میں کم از کم وقاص جیسے رشتے نہیں ملتے۔" ڈیڈی کا ملال کسی طور کم نہیں ہورہا تھا۔ ان کا لہجہ اور انداز بھی بجھ گئے تھے۔

"تم کیا چاہتی ہو کسی چین ڈرنکر' لوز کریکٹر کے ہاتھ ماہ رو کو تھمادوں؟"

"ہر کوئی برا بھی نہیں ہوتا۔" شازمہ بھی جز بز سی ہوئی۔

"تو پھر کوئی بہت اچھا وقاص جیسا تم ہی دکھادو۔" ڈیڈی کا لہجہ اور بھی ویران ہوگیا۔ رہ رہ کے شازمہ کی بہن کے الفاظ یاد آرہے تھے۔ انہوں نے بہت شائستگی کے ساتھ معذرت کرلی تھی۔ کیونکہ وہ یہ رشتہ اس لیے جوڑنا چاہتی تھیں کہ تعلقات بہتر ہوں جب شازمہ کی خواہش ہی نہیں تھی تو وہ کیوں معاملات کو بگاڑتیں۔ انہوں نے باقی باتیں چھپالی تھیں۔

"اوکے، تم ریلیکس فیل کرو۔ میں ماہ رو کے لیے وقاص سے بہتر لڑکا ڈھونڈوں گی۔ یو ڈونٹ وری، مجھے اس پر افسوس ہے۔ ویسے بھی وقاص پہ دنیا ختم نہیں ہوتی۔ ماہ رو کی خواہش بھی نہیں تھی۔ تم اپنی بیٹی کے ساتھ زبردستی بھی تو نہیں کرسکتے۔ میں نے تو ماہ رو کے لیے بہتر سوچا۔ ماہ رو کا انٹرسٹڈ ہونا میٹر کرتا تھا جب وہ راضی نہیں تھی تو تم بھلا کیا کرلیتے؟ میں نے ماہ رو کے لیے کبھی برا نہیں سوچا۔" شازمہ نے لمحوں میں چکنی باتوں سے ایک مرتبہ پھر ڈیڈی کو اس فیز سے نکال لیا تھا۔

جب ڈیڈی بہت دن تک اسی صدمے کے زیر اثر رہے تب ماہ رو نے پہلی مرتبہ گہرائی میں جاکر سوچا۔

"وقاص میں کچھ تو ایسا تھا جو ڈیڈی اس کے لیے اتنا دکھی ہورہے تھے۔" وہ چاہ کر بھی اس خیال سے پیچھا نہیں چھڑا سکی تھی۔ پھر یہ خیال اس وقت ملال میں بدلا تھا جب ماہ رو نے وقاص کو ایک نجی پارٹی میں دیکھ لیا۔



وہ شام بھی خاص سہانی اور ستاروں سے سجی تھی۔ شازمہ کے عزیزوں میں شادی کا فنکشن تھا۔ اور ماہ رو تو بہت کم شازمہ کے فیملی فنکشنز کا حصہ بنتی تھی۔ اس کی اپنی مصروفیات ہی لاتعداد تھیں، لیکن اس شام نہ چاہتے ہوئے بھی ماہ رو کو شازمہ کے ساتھ آنا پڑا تھا کیونکہ ڈیڈی نے پہلی مرتبہ اسے بہت فورس کیا تھا کہ وہ سوشل پارٹیز کی بجائے زیادہ سے زیادہ فیملی پارٹیز اٹینڈ کیا کرے۔ اس کے بے انتہا لبرل' ماڈ اور انتہائی سوشل ڈیڈی کی اس نکتے پہ سوچ بہت مڈل کلاس قسم کی تھی۔ وہ چاہتے تھے ماہ رو کی شادی امیر خاندان میں نہیں بلکہ وضع دار' شریف اور خوش حال فیملی ہو۔ جو نہ صرف ایجوکیٹڈ ہوں بلکہ رکھ رکھاؤ والے' شریف اور عزت دار لوگ ہوں۔ خاص طور پہ لڑکے کا شریف' باکردار ہونا بہت ضروری تھی۔ ڈیڈی کے یہ خیال ماہ رو کے لیے انتہائی حیران کن تھے۔ وہ اپنی بیٹی کے لیے پہلی مرتبہ ایک باپ بن کر سوچ رہے تھے۔ انہوں نے اپنے "سرکل" سے ہٹ کر ماہ رو کے لیے رشتہ تلاش کرنا شروع کیا تھا۔ یہ ہر ایک کے لیے انتہائی تعجب کی بات تھی۔ ڈیڈی کی ڈیمانڈ میں کہیں بھی ایلیٹ کلاس کا داماد نہیں تھا۔ حتیٰ کہ شازمہ تک چیخ پڑی تھی۔

"تم نے اپنی ناک کٹوائی ہے۔ لوگ تو شادیوں کے نام پہ بزنس بڑھاتے ہیں اور ترقی کرتے ہیں اور تم نے بیک گیئر لگا رکھا ہے۔"

"میں نے بیٹی کی شادی کرنی ہے۔ بیوپار نہیں۔"

ڈیڈی کے دوٹوک الفاظ کو سن کر شازمہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئی تھی۔ پھر اس نے ڈیڈی کی تلاش میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کی تھی۔ اور اس کے امیر کبیر باپ کو جس کے لیے بزنس کے داؤ پیچ میں اپنے حریف کو پچھاڑ دینا لمحوں کا کام تھا۔ اپنی ہی بیٹی کے لیے رشتہ تلاش کرنا مسئلہ فلسطین بن گیا تھا۔

آج اس ستاروں بھری شام میں وقاص کو دیکھ کر اسے اپنے ڈیڈی کی ملال بریچ کا گمان ہوا تھا۔

صدا کی بولڈ' بے باک' حاضر جواب ماہ رو وقاص کے مقابل آتے ہی سارے الفاظ بھول سے گئے تھے۔ بھلا اسے کیا تعارف کرواتی؟ کیا یہی کہ تمہارا پرپوزل میرے لیے آیا تھا؟ یا پھر میں نے شازمہ کی چڑ میں بغیر سوچے سمجھے انکار کردیا تھا۔ اور اب ڈیڈی کی خاطر وہ کچھ پچھتا بھی رہی تھی۔ یہ سارے الفاظ اس کے ذہن میں گڈمڈ ضرور ہورہے تھے' لیکن کہنے کے لیے کچھ مزید انرجی کی ضرورت تھی۔ پھر نہ جانے کیسے اس نے چند الفاظ میں معذرت کے لیے ایک پیراگراف ترتیب دے لیا۔ جس میں اس نے اپنی انا کو ہر صورت سربلند رکھنے کی کوشش کی تھی۔ وقاص جیسے سمجھ گیا تھا۔ وہ واقعی بہت ذہین اور ڈیسنٹ انسان تھا۔ انتہائی خوش خلقی کا مظاہرہ کرتا رہا۔ اور یہ منظر شازمہ کو ایک مرتبہ پھر تیر کی طرح دل میں لگا تھا۔ وہ وقاص اور ماہ رو کو ایک ساتھ دیکھ کر شدید ناگواری محسوس کررہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ان دونوں کو ایک جگہ کھڑا بھی نہ ہونے دے۔ بڑے طریقے سے وقاص تک اپنا مدعا پہنچا دینے کے بعد ماہ رو کو یقین نہیں تھا کہ اس کی امی دوبارہ اس کی طلب گار بن کر آجائیں گی۔ پھر بھی ڈیڈی کے لیے ایک کوشش کرلینے میں حرج کیا تھا؟ ستاروں بھری اس شام کے اختتام پہ ماہ رو کچھ خوش فہمی کا شکار ہوچکی تھی کہ شاید ڈیڈی کی خواہش پوری ہوجاتی۔ کیونکہ وقاص کا انداز حوصلہ افزا تھا۔

لیکن اس کی یہ خوش فہمی اس وقت تمام ہوگئی تھی جس وقت وقاص کی امی ان کے گھر آئی ضرور تھیں' مگر وقاص کی منگنی کا کارڈ لے کر۔ تب ماہ رو کو ایسی چبھن تو محسوس نہیں ہوئی تھی جس قدر شازمہ کے رویے نے اسے ہتک کا احساس دلایا تھا۔ وہ بلاوجہ ایک سے زیادہ کئی مرتبہ جتا چکی تھی۔

"وقاص کا رشتہ ہوئے تو ڈیڑھ ماہ ہوچکا۔ تم کس گمان میں تھیں۔ وہ تمہارے حسین سراپے کو دیکھ کر رشتہ توڑ دے گا۔" شازمہ کا استہزائیہ انداز ماہ رو کو پہلی مرتبہ ایک کمپلیکس کا شکار کرگیا تھا۔ وہ اسے محبت نہیں دے سکتی تھی۔ اس کے لیے اچھا نہیں سوچ سکتی تھی تو کم از کم اپنی زبان سے تو محفوظ رکھتی۔ پہلی مرتبہ ماہ رو کو احساس ہوا تھا کہ ڈیڈی اس کے لیے کوئی درمیانہ گھر اور درمیانہ "بر" کیوں تلاش کررہے تھے؟ اس لیے کہ ڈیڈی کو احساس ہوچکا تھا انہوں نے ماہ رو کو ایک "ایب نارمل" زندگی اور "ماحول" دے رکھا ہے۔ شاید وہ اس کی پچھلی زندگی میں در آنے والی محرومیوں کا ازالہ اسی طرح سے کرنا چاہتے تھے اور انہیں یقین تھا کہ ماہ رو ان ہی کی سوسائٹی کے کسی پروردہ شخص کے ساتھ کبھی خوش نہیں رہ سکتی تھی۔ سو ماہ رو سرفراز کا اپر کلاس کی ہر اچھائی برائی سے مرقع اور نمائندہ باپ ان دنوں کسی اپر مڈل کلاس فیملی میں ماہ رو کا رشتہ تلاش کررہا تھا۔



عون عباس کے اس کی زندگی میں آنے سے پہلے کوئی زندگی کا مقصد حیات نہیں تھا' لیکن اب جیسے دل کی نگری بدلتے ہی اندر باہر کے موسموں میں رنگینی آگئی تھی۔ یوں لگتا تھا ہر طرف بہار ہی بہار ہے۔ ابھی تو اس یک طرفہ محبت نے ہر احساس کے رنگ کو تبدیل کردیا تھا۔ اگر اسے یقین ہوتا کہ محبت دو طرفہ بھی ہے تو جانے ماہ رو سرفراز کہاں کہاں اور کس کس مقام پہ سرفراز ہوجاتی؟ لیکن محبت دو طرفہ کہاں تھی؟ کبھی ایک وقت تھا وہ فلسفوں کو کان جھاڑ کر گرا دالتی اور نخوت سے سر جھٹک کے آگے بڑھ جاتی تھی' لیکن اب ماہ رو سرفراز پہ کوئی اور ہی وقت آیا ہوا تھا۔ یوں

لگتا ہر کہانی' ہر لفظ' ہر حرف ہر فلسفہ اسی کے لیے تخلیق کیا گیا ہے۔ اسی کے لیے لکھا گیا ہے۔ اسی کے لیے محفوظ کیا گیا ہے۔

اور کسی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ مقصدیت انسان کو توانا کردیتی ہے۔ اس کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بھی بے دار کردیتی ہے۔ منزل چاہے ان دیکھی ہو' لیکن جب منزل کا تعین کرکے اس کی راہ پر گامزن ہوا جاتا ہے پھر زاد راہ کی بھی سمجھ آجاتی ہے اور رستوں کی رکاوٹ بھی خود بخود دور کرنا آجاتا ہے۔ مقصد کو پانے کے لیے بس خلوص کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اور ماہ رو اس فلسفے کے لفظ لفظ سے طاقت اور توانائی حاصل کرتی تھی۔

اسے یقین تھا۔ راستوں کی رکاوٹیں خود بخود دور ہوجائیں گی۔ منزل قریب آجائے گی۔ کیونکہ اس کی اچانک سوتائی کی طرح بھری محبت میں جنون بھی تھا اور جذبہ بھی خلوص بھی تھا اور عشق بھی۔۔۔ پھر یہ عشق کی تپش کسی اور تک بھلا کیوں نہ پہنچتی؟

یہ آگ' یہ گرمی' یہ جلن' یہ تپش بہت حیران کن انداز میں سب سے پہلے فریحہ تک پہنچ گئی تھی۔ وہ فریحہ جو ماہ رو کے اچانک بدل جانے والے انداز' رسیے اور مزاج پہ حیران تھی۔ صرف لمحوں کی دیر میں گم صم اور حواس باختہ ہوگئی تھی۔ ماہ رو کا وہ حسین چہرہ' وہ دل نشین آنکھیں جن کے ہر رنگ میں عون عباس کے لیے محبت ڈھلتی اور پھیلتی تھی۔ وہ "چاہ" جو چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ یوں ہی ایک اجلی دوپہر فریحہ کی ماں اس کا بازو دبوچ کر کمرے میں لے آئی تھی۔ فریحہ کی طرح اس کی ماں بھی حواس باختہ تھی۔ ان کا چہرہ سپاٹ نہیں تھا' وہاں بے چینی تھی۔ اضطراب تھا اور وہ ٹٹول ٹٹول کر اپنی بیٹی کا عام سا بہت سادہ چہرہ بغور دیکھتیں۔ وہاں بھی الجھن تھی اور ایک بے نام سی بے چینی تھی۔ ایک جھلک پڑتا خوف تھا۔ کچھ کھودینے کی ویرانی تھی۔

ابھی کچھ دیر پہلے اس کی اٹھارویں کال آئی تھی۔ وہ اسی طرح متواتر کال کررہی تھی۔ کبھی کسی بہانے سے' کبھی کسی بہانے سے' وہ ہر روز کال کرتی تھی۔ دن میں کئی کئی مرتبہ۔ اور جب زیادہ بے چین ہوتی تو بہ نفس نفیس پہنچ جاتی۔ گوکہ گھر میں کائنات سمیت ہر ایک کو اس کی آمد بھلی معلوم ہوتی تھی۔ ثنا اور مریم بھابھی تو بہت ہی والہانہ خوشی کا اظہار کرتی تھیں۔

کیونکہ ماہ رو جب بھی آتی ان کے گھر میں ایک نیا کپڑوں کا اسٹائل اور فیشن متعارف کروا جاتی تھی۔ اس سہ پہر بھی وہ تین گھنٹے تک اپنے دلفریب وجود کی مہک بکھیر کر گئی تھی۔ اس کی خوش مزاجی نے گھر بھر کو اس کا گرویدہ کردیا تھا۔ کائنات اور ثنا کو تو خاص طور پہ ماہ رو کا انتظار رہا کرتا تھا۔ وہ دوپہر کو آئی تھی اور سہ پہر میں واپس گئی۔ کائنات' ثنا اور مریم بھابھی تو اسے جانے نہیں دے رہی تھیں' لیکن ظاہر سی بات تھی وہ رک نہیں سکتی تھی۔ جب ان تینوں نے اسے زیادہ مجبور کیا تو ماہ رو بہت دلربائی سے مسکرا کر بولی۔

"میرا تو اپنا دل چاہتا ہے میں ہمیشہ آپ لوگوں کے گھر میں رہوں۔" اس کے لہجے کی معنی خیزیت نے کسی اور پر اثر کیا تھا یا نہیں کیا تھا' لیکن فریحہ کو لمحوں میں فریز کردیا تھا۔ اس کا دل لمحہ بھر کے لیے رکا اور پھر چل پڑا۔ ماہ رو کی بات کا بھلا کیا مفہوم تھا؟ وہ اس کے گھر میں ہمیشہ کے لیے کیوں رہنا چاہتی تھی؟ کیا فریحہ کا گھر ماہ رو کے رہنے' قیام کرنے اور ٹھہرنے کے قابل تھا؟ اور پھر وہ اس گھر میں رہے گی کیوں؟ آخر کیوں؟ کس لیے؟ کس کی خاطر؟ کیا فریحہ کے لیے؟ نہیں' ہرگز نہیں۔۔۔ تو پھر آخر کون تھا جس کے لیے ماہ رو فریحہ کے اس گھر میں رہنا چاہتی تھی۔ جہاں پرائیوسی نام کی نہیں تھی۔ ہر وقت شور اور ہنگامہ بپا رہتا تھا۔ کھانے کے وقت جب گھر کے سب افراد دسترخوان پہ اکٹھے ہوتے تو میلے کا سا گمان ہوتا۔ یوں لگتا کسی کی بارات آئی ہے۔ جس گھر میں ایک وقت میں دیگ کے برابر کھانا پکتا تھا اور جس گھر کے افراد ایک دوسرے سے ریشوں کی مانند جڑے ہوئے تھے ماہ رو جیسی ہستی اس گھر میں قیام کرنا چاہتی تھی؟ کیوں آخر کیوں؟

فریحہ کا دل رکتا کیوں نا۔ اس کے اندر تو ہر وسوسوں کا مینہ برس رہا تھا۔ ماہ رو کی بات پہ ثنا نے بھرپور قہقہہ

لگا کر اسے ساتھ لگا لیا۔

"ایسی حسین شہزادی کو اپنے گھر میں ہمیشہ کے لیے رکھنا ہمارے لیے ایک اعزاز ہو گا ماہ رو۔" ثنا نے بھی بڑے معنی خیز انداز میں جواب دیا تھا۔ پھر ماہ رو چلی گئی۔ اپنی خوشبوؤں کی مہکار چھوڑ کر اپنی موجودگی کا روح میں اتر جانے والا احساس چھوڑ کر چلی گئی تھی اور اس کے چلے جانے کے بعد بھی دو تین گھنٹے تک ماہ رو پہ بحث کرنا ان کے گھر والوں کا معمول بنتا جا رہا تھا۔ وہ سب ماہ رو پہ تبصرے کر رہی تھیں سب کو وہ بہت لونگ' میرباں لگتی تھی اور فریحہ ایسے تبصروں پہ شاکڈ رہ جاتی تھی۔ گو کہ وہ سب ٹھیک ہی تبصرے کرتی تھیں ظاہر ہے وہ لوگ جو دیکھ رہی تھیں اسی تناظر میں کمنٹس دیتیں۔ یہ تو فریحہ جانتی تھی وہ تو مرقع غرور ہوا کرتی تھی۔ یہ تبدیلی تو رحمان منزل میں آنے کے بعد دکھائی دی تھی۔ جو اس کی خوبیوں میں ادغام کر کے منظر عام پر روشن ہو گئی۔ تو پھر یہ اتنی بڑی تبدیلی فریحہ کو کھٹکالی کیوں نا؟ آخر اس "بدلاؤ" کے پیچھے کوئی نہ کوئی سبب تو ضرور تھا؟ اور وہ سبب کیا تھا؟ فریحہ اس کھوج میں نہ پڑتی تو کیا کرتی؟ اور اس نے ثنا کے الفاظ کو ایک مرتبہ پھر ماہ رو کے چلے جانے کے بعد دہرایا بھی تھا۔

"ماہ رو کو تم دیورانی بنانا چاہتی ہو مگر کیسے؟" یہ سوال کرتے ہوئے اس کا دل اتنی شدت سے دھڑک رہا تھا جیسے ابھی کے ابھی پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ ثنا کچھ حیران ہوئی تھی۔ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"عون عباس کو تم نے باؤنڈ کر رکھا ہے۔ عاشر تو ہے نا۔۔۔ عون سے ذرا کم' مگر بے حد بجیلا' اتنا خوب صورت۔" ثنا نے ذرا بلند آواز میں اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ یوں کہ اندر آتا عون عباس لمحہ بھر کے لیے ٹھٹک گیا۔ ایک تو پورے کمرے میں ڈنبل ڈائمنڈ کی خوشبو چکرا رہی تھی۔ انتہائی روح پرور' دل میں اتر جانے والی۔ حواسوں پہ چھا جانے والی۔ اتنی مہنگی اور دلفریب خوشبو۔ عون عباس نے اندر آتے ہوئے ثنا کے کچھ الفاظ سن لیے تھے۔ پھر ان ہی کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"یہ عاشر کو کیوں مسکہ لگایا جا رہا ہے؟"

"مسکہ تو سامنے لگاتے ہیں پیٹھ پیچھے نہیں' میں تو اپنی دیورانی کی سلیکشن کر رہی ہوں۔" ثنا نے ذرا اترا کر بتایا تھا۔ عون عباس بھی ذرا متاثر ہوا۔

"اچھا۔۔۔ تو میں بھی سنوں۔۔۔ عاشر کی قسمت کہاں پھوٹنے کا ارادہ رکھتی ہے؟" اس کا انداز ذرا شرارتی تھا۔

"کرنی تو ہم نے تمہاری تھی۔۔۔ لیکن چونکہ تم پالنے میں فریحہ بنو سے منسوب ہو چکے تھے۔ اس لیے ہم نے عاشر کے لیے ماہ رو کو منتخب کر لیا ہے۔" ثنا نے برجستہ کہا تھا۔ عون عباس بیٹھتے ہوئے اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔ چہرے پہ حیرانگی ہی حیرانگی تھی۔

"ماہ رو؟ وہی۔۔۔؟" اس نے وہی کو اتنا لمبا کھینچا کہ ثنا کو اس کے کندھے پہ دھپ لگانی پڑی تھی۔

"کیا وہی ماہ رو؟ جو مل اونر کی بیٹی ہے۔ فریحہ کی بے ہودہ سہیلی۔۔۔ جینز پہ ٹاپ چڑھا کر فضول پھرتی ہے۔" عون کا موڈ خاصا بگڑ گیا تھا۔ ماہ رو کے بارے میں عون کے جذبات ملاحظہ کر کے اندر کہیں فریحہ کے من میں عجیب سا سکون اتر آیا تھا۔ گھر میں کوئی تو تھا جو ماہ رو کے متاثرین میں شامل نہیں تھا۔ اک گونا اطمینان نے فریحہ کی آنکھوں میں بسیرا کر لیا تھا۔

"چھوڑو بھی' اتنی تو حسین ہے۔۔۔ اور خوب صورت لوگوں کو سب کچھ پہننے کا حق ہے۔" مریم نے بے تکی سی بات کی تھی۔ عون عباس کی آنکھوں میں استہزا سا پھیل گیا۔

"خوب صورتی کا مطلب کیا یہ ہے آپ حسن کی تشہیر کے لیے فضول لباس پہن کر آوارہ پھریں۔" اس نے انتہائی تلخ لہجے میں جواب دیا تھا پھر فریحہ سے مخاطب ہوا۔

"تم اس سے میل جول ذرا کم ہی رکھو۔" خاص طور پر فریحہ کو تنبیہہ کر کے وہ اپنے کمرے کی طرف چلا گیا تھا جبکہ بھابھیوں کے منہ اتر گئے تھے۔

"بڑا ہی زاہد خشک ہے۔ ورنہ ماہ رو کو دیکھ کر تو اچھے میرڈ حضرات کا بھی ایمان ڈول جائے۔ رات کو قاسم

بھی ماہ رو کی تعریف کر رہے تھے۔" ثنا کو نہ جانے کیا کچھ یاد آگیا تھا اور فریحہ کے دل اور ذہن سے جیسے منوں بوجھ اتر گیا۔ وہ تو یہ تک بھی بھول چکی تھی کہ ماہ رو کو کل صبح گیارہ بجے رحمان پلازہ جانا تھا اپنے لیے سوا لاکھ کا نیا موبائل لینے۔ بلاوجہ اور بے مقصد ہی۔



تایا نے اگلی صبح فریحہ سے بڑے پیار اور محبت سے ناشتا کرتے ہوئے کہا۔

"فریحہ! اب تم کالج مت جایا کرو۔ نوکری کا شوق تو پورا ہوا۔ ہم تمہاری شادی کا ارادہ رکھتے ہیں۔" فریحہ نے دھڑکتے دل کے ساتھ تایا کا حکم نامہ سنا تھا اور پھر اندر جا کر چادر اور پرس اتار کر رکھ دیا اس کے خاندان میں بے ادبی یا نافرمانی کا کوئی رواج نہیں تھا۔ ایک دفعہ تایا نے اس کی بات مانی تھی۔ ایک مرتبہ اس نے تایا کی بات مان لی۔ ویسے بھی گھر میں اس کی شادی کے تذکرے چل رہے تھے۔ تائی اور کائنات وغیرہ بہت پرجوش تھے۔ گھر میں پھر سے خوشی کے شادیانے بجنے والے تھے۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی اور عون عباس بہت لاڈلا اور فرماں بردار بیٹا۔ دونوں کی شادی بہت دھوم دھام سے کرنے کا ارادہ تھا۔ ابا اور تایا بھی بہت خوش تھے۔ اور فریحہ کی امی تو جیسے شکر کر کے نہیں تھک رہی تھیں۔ اس رات امی نے ایک مرتبہ پھر اپنے خدشے کا اظہار کیا تھا۔

"میں تو ڈر رہی تھی فریحہ! تمہاری تائی، کائنات اور بھویں اس ماہ رو پہ فریفتہ ہو چکی تھیں مجھے خوف تھا شاید وہ لوگ رشتہ ہی نہ توڑ دیں۔ آخر ماہ رو کی چمک دمک کے سامنے تم کہاں ٹھہر سکتی ہو۔ میرا دل تو مانو بڑا بے قابو تھا، لیکن صد شکر کے بھابھی وغیرہ کی نیت نہیں بدلی۔" امی نے اسے سینے سے چمٹا لیا تھا۔ فریحہ نے سکون سے ان کے کندھے پہ سر رکھ لیا۔

"یہ ممکن تھا کیا امی! تایا اور تائی کی محبت اور نیت پہ کیوں شک کر رہی تھیں۔ وہ مجھ پہ کبھی کسی ماہ رو کو فوقیت نہیں دے سکتے۔ آپ فکر مت کریں۔ عون میرا ہے اور میرا ہی رہے گا۔" اس کی آواز مدھم ہو کر بالکل معدوم ہو گئی تھی۔ دل میں سکون ہی سکون تھا۔ وہاں کوئی بھی خدشہ ڈگمگا نہیں رہا تھا۔

"تو اور کیا... میں تو وہم میں پڑ گئی تھی۔ ماں ہوں نا کیا کروں؟ دل سوکھے پتے کی طرح کانپتا تھا۔ تم نے دیکھا نہیں... اس کے یہاں پھیرے اور چکر۔" امی کو اور بھی بہت کچھ یاد آگیا۔

"وہ ہمیشہ عون کی غیر موجودگی میں آتی تھی۔ اب بھلا کیا خاص بات ہوگی؟" جو بھی تھا۔ ان کا وہم بے جا نہیں رہا تھا۔

"وہ ڈپریسڈ تھی امی! یہاں اس کا ماحول چینج ہو جاتا تھا۔" فریحہ نے اپنے خدشات کا ذکر کر کے ماں کو مزید پریشان نہیں کرنا چاہا تھا۔

"مگر مجھے عون پہ پورا اعتماد ہے۔" اس کے لہجے میں تفاخر بول رہا تھا۔

"ہاں ماشاء اللہ۔ ہمارا عون ایسے ویسے کسی کو گھاس نہیں ڈالتا۔" امی نے جیسے غائبانہ عون عباس کی بلائیں لی تھیں۔

"ویسے یہ ماہ رو... اس کے انداز، مجھے کچھ کھٹک ضرور رہا تھا۔ جیسے کچھ ہونے والا تھا یا اس کے دل میں کچھ چھپا تھا۔" امی کو پھر تھوڑی دیر بعد خیال آگیا۔

"آپ وہم میں نہ پڑیں۔" فریحہ نے لاپروائی دکھائی۔

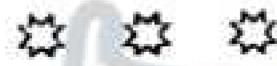
"تم بھی باہر نکلنا بند کرو اور ماہ رو سے رابطہ بھی۔" انہوں نے جیسے تنبیہہ کی تھی۔ فریحہ ذرا چونک گئی۔

"اتنا اچانک تو رابطہ ختم نہیں کر سکتی۔ ہاں شادی کے بعد نہیں رکھوں گی۔ امی! اچھا بھی تو نہیں لگتا۔ اتنے سالوں کا ساتھ ہے۔ پھر اس کی ثنا اور مریم سے بہت انڈرسٹینڈنگ ہو چکی ہے۔ وہ لوگ بھی ماہ رو سے کانٹیکٹ میں ہیں۔" فریحہ نے اس نکتے کی طرف امی کی توجہ مبذول کروائی تھی۔

"چلو، اللہ بہتر کرے گا۔ تم پریشان مت ہو۔" انہوں نے فریحہ کی پیشانی چوم لی تھی۔

"آپ بھی عون کے حوالے سے پریشان مت

ہوں۔ وہ تایا کے لبوں سے نکلنے والے فرمان کو حکم کا درجہ سمجھتا ہے۔ تایا جو کہیں اس پہ آنکھ بند کر کے عمل کرتا ہے۔ کبھی اس نے تایا کے سامنے سر نہیں اٹھایا۔ وہ اسے کنویں میں کودنے کے لیے بھی کہیں گے تو وہ انکار نہیں کرے گا۔" فریحہ نے اطمینان سے آنکھیں موندلی تھیں۔ اس کے لہجے میں یقین بول رہا تھا اور اس کا یقین باطل نہیں تھا۔ واقعی ہی عون تایا کے سامنے سر نہیں اٹھاتا تھا۔ وہ اسے کنویں میں کودنے کے لیے کہتے اور وہ کود پڑتا۔ (کیونکہ عون عباس بہت شروع میں بہت سارے معاملات میں ہٹ دھرمیاں دکھانے کے اب اب سدھر چکا تھا) اور پھر وقت اسے اس انتہائی موڑ پر بھی لے آیا تھا جب فریحہ کا یقین باطل نہ ہو سکا اور عون عباس کو تایا کے کہنے پہ کنویں میں کود جانا پڑا۔ زہر سے بھرا جام لبوں سے لگانا پڑا۔



یہ بڑی چمکیلی سی شام تھی۔ کچھ کچھ گلابی اور رنگین بھی۔ ماہ رو آج بڑی ترنگ کے عالم میں تیار ہوئی تھی۔ اس نے سلیولیس شرٹ کے ساتھ بلیک ٹائٹس پہن رکھی تھی۔ لمبے حسین مشک بار بال کمر پہ جھول رہے تھے۔ میک اپ سے مبرا چہرہ دودھ سے دھلا اور گلاب سے تر تر لگتا تھا۔ اس کی بھیگی پلکیں اور لمبی گہری آنکھیں اس کے حسن کا مکمل سنگھار تھیں۔ سفید ملائم پیروں میں ہائی ہیل پھنسا کر جب وہ ایک خاص ترنگ میں نیچے آئی تو شازمہ نے اسے کچھ خاص ادا سے دیکھا تھا۔ آج شازمہ کو ماہ رو میں کچھ تبدیلیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ جیسے وہ کسی خاص مقصد کے لیے جارہی تھی یا کسی خاص فرد سے ملنے کو جارہی تھی۔ ماہ رو اس کے قریب سے گزری تو شازمہ نے بے ساختہ اسے روک لیا تھا۔

"ماہ رو جان! کہاں کی تیاری ہے۔ آج کہیں خاص جارہی ہو؟"

"فریحہ کی طرف۔"

"اتنا رومانٹک تیار ہو کر؟" شازمہ کی معنی خیزئیت میں دوستانہ قسم کا ایک دانہ سا تھا۔ جس کی ہڑک میں وہ چکنی ہوئی بڑی آسانی سے پھنس سکتی تھی۔ شازمہ کو اناڑی عاشق کو گھیر لینے کے بڑے داؤ پیچ آتے تھے۔ سو ذرا سا تردد کرنا پڑا تھا۔ ماہ رو خود بخود رام ہو گئی تھی۔ پھر سچ تو یہ تھا ڈیڈی تک اپنی خواہش پہنچانے کے لیے اسے شازمہ کا سہارا تو درکار تھا۔ شازمہ کے بغیر بات آگے بڑھنا ناممکن تھی۔ اسے شازمہ کو اعتماد میں لینا ہی تھا۔ پھر ابھی کیوں نہیں؟ حالانکہ وہ سوچ رہی تھی ایک مرتبہ عون سے بات کرلے گی پھر ڈیڈی اور شازمہ کو بتائے گی۔ اسے امید تھی ڈیڈی ہلکے پھلکے اعتراض کے بعد مان ضرور جائیں گے۔ انہیں صرف عون عباس کے "کاروبار" پہ اعتراض ہو سکتا تھا، مگر عون پہ کبھی نہیں۔ اتنا یقین تو ماہ رو کو بھی تھا ہی۔ پھر تھوڑی سی پس و پیش کے بعد ماہ رو نے شازمہ کو عون عباس کی فیملی کے متعلق سب کچھ بتا دیا۔ یہ بھی کہ وہ فریحہ کا کزن ہے اور اس نے پہلی مرتبہ عون عباس کو رحمان پلازہ میں دیکھا تھا۔ شازمہ تو سن کر بڑی ایکسائٹڈ ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"بائی گاڈ! تمہارے ڈیڈی کو ایسا ہی داماد چاہیے۔ جو اپر مڈل کلاس سے ہو۔ تم سے دب کر رہے۔ اور تمہاری عزت کرے۔ تم نے اچھا ہاتھ مارا ہے ماہ رو۔" شازمہ کے تعریف بھرے انداز بھی اپنے جیسے ہی تھے۔ گو کہ وہ سر دھن رہی تھی اور ماہ رو کی پسند کو سراہ رہی تھی۔ پھر بھی ماہ رو کو بہت عجیب لگا تھا۔

"آپ کا کیا خیال ہے؟ ڈیڈی مان جائیں گے۔" ماہ رو نے کچھ متفکر انداز میں پوچھا تھا۔ اسے ڈیڈی کی طرف سے خاصے خدشات تھے۔

تمہارے لیے من پسند رشتے کی تلاش میں سرفراز خاصا خوار ہو چکا ہے۔ آئی تھنک وہ مان جائے گا۔" شازمہ کے تسلی دینے والے انداز بھی جداگانہ قسم کے تھے۔ ماہ رو کی تسلی تو ہو گی۔ کیونکہ شازمہ جو کہہ دیتی تھی۔ ویسا ہو کر رہتا تھا۔

"تم عون عباس کی فکر کرو۔ اس سے کہو، اپنا

پرپوزل بھیجے۔ باقی کام میرے سپرد۔ دیکھنا، تمہارے ڈیڈی کو کیسے مناتی ہوں۔" شازمہ نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا تھا۔ گوکہ ان دونوں میں اچھے تعلقات کبھی نہیں رہے تھے پھر بھی ماہ رو کو اپنا رویہ کچھ اور بدل کے تعلقات بہتر بنانے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ کیونکہ فیوچر قریب میں اسے شازمہ کی کافی خدمات حاصل کرنا تھیں۔ ماہ رو بہت اطمینان کے ساتھ سارا بوجھ سر سے اتار کر عون عباس سے ملنے جا رہی تھی۔ یہ ملنا موبائل خریدنے کے بہانے سے تھا۔ اسے امید تھی، اس ملاقات سے اگلی ملاقات تک وہ اپنا حال دل عون عباس تک پہنچا دے گی۔ اس کے بعد فریحہ کو اعتماد میں لے گی۔

اس کے ارادے بہت ٹھوس اور مستحکم تھے۔ اسے اپنی نیت اور محبت پر پورا اعتماد تھا۔ ماہ رو کو یقین تھا اس کی محبت کبھی ٹھکرائی نہیں جائے گی۔

ماہ رو کو بااعتماد قدموں سے باہر جاتا دیکھ کر شازمہ بڑی ادا سے مسکرا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ جس کو سمجھنا ماہ رو جیسے اناڑیوں کا کام نہیں تھا۔



رحمان پلازہ کی ٹھنڈی پلاسٹر آف پیرس کی چھت تلے چلنا بڑا دشوار قسم کا کام تھا۔ دل پہ عجیب گھبراہٹ سوار تھی۔ ہتھیلیوں میں بار بار نمی سی اتر آتی۔ چہرہ انتہائی گرم اور سرخ ہو رہا تھا۔ جیسے آگ کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔

ماہ رو کا ایک دفعہ تو دل چاہا الٹے قدموں واپس پلٹ جائے لیکن پھر اس کا ازلی اعتماد عود آیا تھا۔ گوکہ اس نے فریحہ کو ساتھ لانے کی بہت کوشش کی تھی لیکن فریحہ فون پہ مل کے نہیں دی رہی تھی۔ پھر یہ جانا اس نے ضروری نہیں سمجھا تھا۔

پھر کچھ سوچ کر خود ہی پل صراط تک آگئی۔ جب چلنا خود تھا اور جلنا بھی خود تھا تو پھر کسی سہارے کو کیوں تلاش کرتی؟

آدھا گھنٹا بے مقصد اوپر نیچے گھومنے کے بعد بالآخر اس نے ایک سیل بوائے سے عون عباس کے بارے میں پوچھ ہی لیا تھا۔ اس لڑکے نے اسے سیکنڈ فلور کا بتایا۔ دل کڑا کر کے ماہ رو سیکنڈ فلور پر آگئی تھی۔ یہ بھی جگمگاتا فلور تھا۔ ساری مشینری، الیکٹرونکس کے سامان سے بھرا ہوا۔ یہاں بھی بلا کا رش تھا۔ اور لوگ دھڑا دھڑ جہیز پیکجز خرید رہے تھے۔ کیونکہ آج کل شادیوں کا سیزن تھا۔

ایک طرف کمپیوٹرز، لیپ ٹاپ، اور موبائل وغیرہ شو ریکس میں سجے تھے۔ وہیں کار نر پہ خوب صورت ریوالونگ چیئر پہ عون عباس بیٹھا دکھائی دے گیا تھا۔

اس کے سامنے لیپ ٹاپ کھلا ہوا تھا۔ نیلگوں روشنی کا عکس اس کے مغرور وجیہہ چہرے کو روشن کر رہا تھا۔ وہ اپنے کام میں بے انتہا منہمک تھا۔ جیسے اسے اردگرد کی پروا نہیں تھی۔

ماہ رو جیسے لمحوں میں تھم گئی تھی۔ پھر بے خود سی عون عباس کو دیکھے گئی۔

یہ محبت بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ ماہ رو جیسوں کو بے بس کر دیتی تھی۔ بھکاری بنا دیتی ہے۔ آخر یہ محبت کیا بلا ہے؟

اس قدر لاچار کر کے پبلک پلیس پہ ماہ رو جیسی پارہ صفت کو، نہ آگے بڑھنے دے، نہ پیچھے ہٹنے دے۔ یہ محبت آخر کیا ہے؟

یہ دل کی آواز تھی۔ جس نے یہاں سے وہاں تک کا سفر یا آسانی کر لیا تھا۔ اور کسی کی آگ آگ نگاہوں کی گرمی آگ، حدت اور تپش نے عون عباس کو گردن گھمادینے پر مجبور کر دیا تھا۔

کسی میکانکی کیفیت میں وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور پھر تھم گیا۔ کیا اس کے دل پہ کوئی واردات ہوئی تھی؟ یا پھر ماہ رو کے عشق کی گرمی نے مقناطیس کی طرح عون عباس کے دل کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی تھی؟ جو بھی تھا۔ عون عباس نے نادانستہ کسی اور ہی گیان و دھیان میں بلا ارادہ اپنے دل کے مقام پر لمحہ بھر کے لیے ہاتھ ضرور رکھا تھا۔

گویا وہ تھم گیا تھا۔ ایک طوفان تلے آنے سے بچ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ دیر پہلے اچانک اتر آنے والے زلزلے کے آثار تک نہیں رہے تھے۔ وہ لمحوں میں سنبھل گیا تھا۔ وہ لمحوں میں بدل گیا تھا۔

کچھ دیر پہلے ماہ رو نے اس کی آنکھوں اور چہرے پہ الوہی رنگ اترتے دیکھے تھے۔ لیکن اس وقت وہ وجیہہ چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ انتہائی سخت' روڈ' اجنبی اور بیگانہ۔ یوں جیسے پہچانتا ہی نہ ہو۔

ماہ رو کو چلتے چلتے اور کاؤنٹر تک جاتے جاتے چکر سے آ گئے تھے۔ وہ اسے دھیان سے دیکھنا چاہتی تھی۔ اسے قطرہ قطرہ دل میں اتارنا چاہتی تھی۔

ماہ رو کو یاد تھا اور اسے آج بھی یاد تھا۔

اس وقت عون عباس نے بلیک ٹو پیس پہن رکھا تھا۔ اس کی شرٹ کا اوپری بٹن کھلا تھا۔ اس نے بڑے اہتمام سے شیو بنا رکھی تھی۔ اس کے چہرے پر تازہ شیو کی نیلاہٹیں بہت واضح تھیں۔ اس کی رنگت انتہائی سرخ اور انتہائی سفید تھی۔ اور آنکھیں سیاہ آسمانوں جیسی۔ اتنی وسیع اور بہت گہری۔ ماہ رو کا دل ڈوبا اور پھر کبھی ابھر نہ سکا۔ عمر بھر کے لیے ڈوب گیا۔ رنگین سی آنکھوں کا اسیر ہو گیا۔ ماہ رو کو یاد تھا۔ آج بھی یاد تھا۔

وہ موبائل فون خریدنے کے لیے عون عباس کے قریب گئی تھی اور اپنا متاع دل بیچ آئی۔ اپنی انا' وقار اور عزت نفس بیچ آئی۔ وہ خود کو پورا پورا نیلام کر آئی۔

کیونکہ اس نے موبائل فون خریدنے کے لیے ہی عون عباس سے کلام کیا تھا۔ وہ پورا گھنٹا موبائل فون کا بہانہ بنا کر عون عباس سے کلام کرنا چاہتی تھی۔ گفتگو کو طویل کرنا چاہتی تھی۔ اور اپنا مدعا بیان کرنا چاہتی تھی۔ اپنا حال دل سنانا چاہتی تھی۔

لیکن کچھ بھی نہ کر سکی۔ کھڑی کھڑی بس ساکت رہ گئی تھی۔ اور وہ اس کی انا اور غرور کو پیر تلے روند کر چلا گیا تھا۔ جاتے وقت اس نے اپنے بھائی عاشر سے محض اتنا کہا تھا۔

"میڈم کو ان کی پسند کا فون دکھا دو۔"

اس نے مزید کچھ بھی نہیں کہا۔ اس سے بیوپار تک کی بات بھی نہیں کی۔ کلام تک گوارا نہیں کیا۔ وہ اسے ایک کسٹمر جتنی اہمیت دیے بغیر ایسے گیا کہ لوٹ کر نہ آیا۔ وہ پون گھنٹہ کھڑی رہی۔ ڈیڑھ گھنٹا پورے پلازہ میں بے مقصد گھومتی رہی۔ دو گھنٹے گاڑی میں جلتی رہی۔ چار گھنٹے محض اندر کی آگ اور تپش کو بجھانے کی خاطر سڑکوں کو روندتی رہی۔ اور اگلے چوبیس گھنٹے لگاتار روتی رہی۔ روتی رہی۔ صرف اتنی سی بات پر کہ عون عباس نے اسے ایک کسٹمر جتنی بھی اہمیت نہیں دی تھی۔

اس نے نیا خریدا ہوا موبائل پرزے پرزے کر کے ہواؤں کے سپرد کیا اور اسٹرینگ وہیل پر سر رکھے رات بھر دیوانوں کی طرح روتی رہی۔ روتی رہی۔ عالم جنون میں روتی رہی۔

☆

ہم سے کہیے درد کے قصے
ہم سے کہیے رنج کی بات
ہم پر بیتے کیا کیا موسم
تنہا دل' لاکھوں آفات

کسی نے کہا اور سچ ہی کہا تھا۔ صرف ماہ رو سرفراز کے لیے کہا تھا۔

"محبت جنہیں یاد کرتی ہے' انہیں سدا سفر میں دوڑاتے پھرتی ہے' محبت صرف جوگ ہے۔" اور واقعی محبت صرف جوگ تھی۔ اور محبت صرف روگ تھی۔ وہ جان گئی تھی۔ اس پر برسات کے موسم اتر رہے تھے۔ دل ٹوٹ کے ہارا تھا۔ دل درد کا مارا تھا۔

کہیں چین نہیں تھا۔ کہیں امان نہیں تھی۔ آگ تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ جیسے دنوں میں سودائی ہو۔ پرائی ہو۔ وہ تو اکلوتی سہیلی فریحہ کے اندر اترتے موسموں سے بھی انجان اور بیگانہ تھی۔ دل نے بھیس کیا بدلا وہ ساری دنیا سے خفا اور ناراض ہو گئی۔

دوسری طرف فریحہ کو بھی چین کہیں نہیں تھا۔ گھر بھر میں شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ہر طرف

ہنگامے اور رونقیں تھیں لیکن فریحہ کے من سے چین کا پنچھی نجانے اڑ کر کہاں چلا گیا تھا؟ اتنی دور گیا کہ لوٹا ہی نا۔ وہ سارا دن بولائی بولائی غمگین پھرا کرتی تھی۔

"تائی' امی اور بھابھیاں ان دنوں جہیز اور بری جمع کر رہی تھیں۔ وہ گھر میں کم کم ہی دکھائی دیتیں۔ اس دن بھی فریحہ اکیلی تھی۔ اور بہت ہی اکیلی تھی۔

بوگن ویلیا کے پھولوں کو چنتی جانے کیوں وہ ماہ رو کو ان دنوں اتنا تسلسل سے یاد کر رہی تھی۔ وہ ماہ رو جس کی بہت دن سے کوئی کال نہیں آئی تھی۔ نہ اس نے خود چکر لگایا تھا۔ جانے ماہ رو کس حال میں تھی؟ فریحہ کا دل جیسے جیسے شادی کے دن قریب آ رہے تھے بجھتا جا رہا تھا۔

وہ اس وقت بھی بے چینی سے ماہ رو کو سوچ رہی تھی۔ وہ اتنی اچانک ہی ہی آئی تھی اور اتنی اچانک ہی چلی جاتی تھی۔ شاید واپس ابراڈ چلی گئی تھی۔ بنا بتائے۔ بغیر اطلاع کے۔ اور فریحہ نے بھی تو ماہ رو کو شادی کی اطلاع نہیں دی تھی۔ جانے کیوں امی نے اسے منع کر دیا تھا۔ ان کے وہی پرانے وہم اور وسوسے۔

وہ سر جھکائے پتی پتی اٹھا رہی تھی جب اچانک قدموں کی چاپ پہ سر اٹھا کر دیکھنے لگی۔ سامنے عون عباس کھڑا تھا۔ ویسا ہی مکمل' شاندار اور دلوں کو دھڑ دھڑ دھڑکانے والا۔ کافی کلر کے سوٹ میں آج بھی اتنا ہی تابناک اور عالی شان تھا۔

فریحہ کا دل بھر بھر آیا۔

اس گھر میں فریحہ کی عون سے بہت دوستی تھی۔ بچپن سے لے کر اب تک۔ وہ دونوں اپنی بہت سی باتیں ایک دوسرے سے شیئر کرتے تھے۔

وہ اپنی یونی ورسٹی کے قصے اسے سناتا تھا۔ فریحہ دن بھر کی گوسپ اس کے گوش گزار کرتی تھی۔ جب وہ بڑے ہوئے تو پسندیدگی کچھ اور قربتوں میں ڈھل گئی۔ چونکہ والدین کی خواہش تھی سو دونوں نے کوئی بھی اعتراض نہیں کیا تھا۔ ایک رشتہ جڑا اور بندھ گیا۔

نہ تو عون عباس کا کوئی آئیڈیل تھا۔ نہ اس نے ایسی نگاہ سے کسی لڑکی کو دیکھنا چاہا تھا۔ گو کہ یونی ورسٹی میں بہت سی لڑکیاں محبت کا ہاتھ بڑھا کر ناکام لوٹی تھیں۔ وہ ہمیشہ محبت کے معاملے میں کورا ہی رہا تھا۔ بس جو والدین نے پسند کیا اس کو پسند کر لیا۔ اس پہ شکر کیا۔

کبھی نہ اپنی مرضی چلائی نہ پسند کے نام پہ والدین کو شرمندہ کیا۔ زندگی کے کلی اختیار والدین کو تھما کر مطمئن ہو گیا تھا۔ (کم از کم لڑکی پسند کرنے کے معاملے میں اس نے اپنے باپ سے کوئی اختلاف نہیں کیا تھا)

فریحہ عام سی تھی۔ سادہ تھی' خوب صورت نہیں تھی۔ جو بھی تھا۔ اسے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ہاں سب سے بڑی بات اس کے والدین کی پسند ضرور تھی۔ سو اس کی بھی پسند بن گئی۔

فریحہ کی سادگی' شرافت' وقار اور سیرت نے عون عباس کے لیے پسندیدگی اور چاہت کے سارے در خود بخود وا کر دیے تھے۔ پھر پیچھے رہ کیا جاتا تھا؟ محبت؟ جو شادی کے بعد خود بخود دلوں میں اتر جاتی ہے۔ اور اس وقت بھی فریحہ کے انتہائی سادہ اور زرد چہرے کو دیکھ کر وہ شوخ ہونے کی بجائے کچھ متفکر ہو گیا تھا۔ فریحہ بھی اسے دیکھ کر کچھ گھبرا گئی تھی۔ آج کافی دنوں بعد سامنا ہوا تھا۔

"یہ تم نے بھوک ہڑتال کیوں کر رکھی ہے؟" اس نے متفکر انداز میں گفتگو کا آغاز کیا۔ فریحہ کچھ اور گھبرا گئی تھی۔

"نہیں تو۔"

"پھر اتنا زرد کیوں ہوتی جا رہی ہو؟ کیا تمہیں شادی کے بعد کوہ قاف جانا ہے؟ بس ایک کمرہ بدلنا ہے۔" اس نے اب کی دفعہ ذرا مسکرا کر ہلکے پھلکے انداز میں کہا تھا۔

"میں نے کچھ غلط کہا؟"

"نہیں تو۔" فریحہ نے سابقہ الفاظ ہی دوہرا دیے۔

"پھر کھاتی پیتی کیوں نہیں؟ اتنی اپ سیٹ کیوں ہو؟" وہ نرمی سے استفسار کر رہا تھا۔ فریحہ کے دل کو ڈھارس سی پہنچی تھی۔ اس نے تھوک نگل کر بتایا۔

"کھاتی تو ہوں۔ ایسے ہی دل گھبراتا ہے۔" اپنے

دھیان میں اس نے دھیمی آواز میں کہہ دیا تھا۔ عون کے ہونٹوں پر تبسم سا بکھر گیا۔

"اوہ۔۔۔ اچھا، تو معاملہ دل کا ہے۔ میں تو کچھ اور ہی سمجھ رہا تھا۔" اس نے شرارتی انداز میں کہا۔

"تم کیا سمجھ رہے تھے۔۔؟" وہ ذرا گھبرا گئی تھی۔

"کچھ نہیں۔ میں تو معدے کا معاملہ سمجھ رہا تھا۔ کھانا پینا جو چھوڑ رکھا ہے۔ سوچا تمہیں ڈاکٹر کو دکھا دوں۔" اس کی شرارت ہنوز برقرار تھی۔

"ایسی بات نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔ بس ماہ رو کو سوچ رہی تھی۔" بلا ارادہ ہی ایک فضول بات اس کے منہ سے اچانک پھسل گئی۔ بھلا یہاں ماہ رو کا ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ امی ہوتیں تو اسے اچھی طرح بتاتیں۔ کیا فریحہ سا بے وقوف اور احمق بھی کوئی اور تھا؟

"ماہ رو۔۔۔؟" عون کی پیشانی پہ نامعلوم سی سلوٹ ابھر آئی تھی۔ وہ اس کے پلازہ میں آئی تھی۔ موبائل لینے' اور اس کے انداز' اس کا چہرہ' اس کی آنکھیں۔ اف' ابھی تک اس کا اپنا دل کانوں میں دھڑک رہا تھا۔ ایک مرد ہو کر اس کی ایسی کیفیت تھی۔

وہ آنکھیں۔ ان آنکھوں کے رنگ' حکایتیں' کہانیاں۔ افسانے' کچھ پیغام دیتے نئے راز۔ عون عباس کو لگا اگر وہ دوسری بھی غیر ارادی نگاہ ڈال گیا تو سراپا پگھل جائے گا۔ ان آنکھوں کے سمندر میں ڈوب جائے گا۔ بہہ جائے گا۔ کبھی ابھر نہ سکے گا۔ کیسی افسانوی آنکھیں تھیں۔۔؟ اور کیسے رومانوی تاثر تھے۔

تب اس نے آنکھوں کے رخ موڑ لیے تھے۔ وہ ڈوبنا نہیں چاہتا تھا۔

اور وہ ان قاتل آنکھوں کے "سم" سے بچ بچا کر باحفاظت فریحہ کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔

اور اس وقت فریحہ اسی سہیلی کا ذکر چھیڑ رہی تھی جس پہ ایک نگاہ نے اس کے زماں و مکاں گھما ڈالے تھے۔ صرف ایک ہی غیر ارادی اچٹتی سی نگاہ کا اتنا سا کمال تھا۔ اور یہ "کمال" کیا کم تھا؟ اور کیا واقعی ہی کم تھا؟

"وہ موبائل لینے آئی تھی۔" عون عباس کو بتانا ہی پڑا۔ فریحہ ٹھٹک گئی تھی۔ تو کیا واقعی ہی ماہ رو وہاں تک پہنچ گئی۔؟ اس کے خدشات بے بنیاد نہیں تھے۔ وہ ٹٹولتی نگاہوں سے عین سامنے کھڑے عون کا چہرہ دیکھتی رہی تھی۔ جیسے کسی انہونی کا راز پانا چاہتی ہو۔ لیکن اسے عون کے چہرے سے کچھ نہیں ملا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔

"تم نے ماہ رو کو کیسا پایا؟" فریحہ کے منہ سے بے ساختہ پھسل گیا۔ اسے گمان نہیں یقین تھا کہ عون عباس دو ٹوک الفاظ میں بس اتنی سی تشریح کرے گا۔ "انتہائی فضول۔" وہ ہمیشہ یہی کہتا آرہا تھا۔

عون اس کے سوال پر لحہ بھر کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ وہ فریحہ کو کیا جواب دے؟ اس نے ماہ رو کو کیسے' کس طرح سے پایا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہی عکس لہرا گیا۔

عون عباس بھلا فریحہ کو کیا بتاتا؟ اس نے ماہ رو کو اب کی دفعہ کتنا عجیب اور مختلف پایا تھا۔ ادھر فریحہ جیسے جواب کی غرض سے الرٹ کھڑی تھی۔ جواب لیتے ہی اطمینان کی بانسری بجاتی اندر چلی جاتی۔ عون لحہ بھر کے لیے سوچتا رہا۔ پھر باہر کی طرف نکلتے ہوئے محض اتنا سا بولا۔

"سر پھری۔"



وہ تین دن بخار میں پھنکتی رہی۔ تین دن اسے کسی چیز کا ہوش نہیں رہا تھا۔ تین دن اس نے عون عباس کی اتنی معمولی سی "بے اعتنائی" کا سوگ منایا تھا۔ اور اگر کبھی وہ سچ مچ جان بوجھ کر بے اعتنائی برتتا تو وہ ماہ رو کا حال کیا ہوتا؟ وہ مرجاتی کیا؟ اس کی سانسیں بند ہوجاتیں۔

پچھلے تین دن سے وہ کمرے میں بند پڑی تھی۔ ہوش و خرد سے بیگانہ تھی۔ اور پچھلے تین دن میں ہی ایسے اور اک ہوا تھا۔ وہ اپنے ڈیڈی کے لیے کس قدر قیمتی تھی۔ کس قدر انمول تھی۔ اور اس کے ڈیڈی

کسی اذیت میں مبتلا تھے۔ اسے تکلیف میں تڑپتا دیکھ کر کتنے بے چین تھے۔

اور شازمہ بھی خاصی متفکر دکھائی دیتی تھی۔ جیسے ہی ڈیڈی بیڈ روم سے نکلے وہ لپک کر اس کے قریب آگئی تھی۔ پھر بہانے بہانے سے وہ عون کے بارے میں کریدتی رہی۔ جس ذکر سے ماہ رو بچنا چاہتی تھی وہی باربار ساعتوں میں اتر رہا تھا۔ عون عباس کے نام پر اس کی آنکھیں لبالب آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ شازمہ جیسے خود بخود سمجھ گئی تھی۔ مزید اس نے کریدا نہیں تھا۔ لیکن اتنا ضرور کہا۔

"اتنی آسانی سے ہار ماننے والے بزدل ہوتے ہیں۔ محبت اور جنگ میں سب جائز مانا جاتا ہے۔" اس نے جیسے ماہ رو کو ایک نئی راہ دکھانی چاہی تھی۔

اور ماہ رو ہر اس راہ کی طرف لپک سکتی تھی جو اسے عون عباس تک پہنچانے کا رستہ دکھاتی۔ اسے منزل تک لے جاتی۔

شازمہ نے اسے اکسایا تھا وہ بستر پہ بزدلوں کی طرح مت پڑے بلکہ ہمت اور بہادری کی نئی مثال قائم کرتے ہوئے عون عباس کی زندگی کے رخ موڑ دے۔ جو بھی تھا شازمہ کی باتوں نے ماہ رو کے اندر ایک نئی زندگی کی لہر دوڑا دی تھی۔

وہ پہلے ہی مقام پہ دل ہار کے بستر پر پڑ چکی تھی۔ اسے اٹھنا ہی تھا۔ اور اپنے حصے کی خوشیوں کو وصول کرنا ہی تھا۔

کیا تھا اگر وہ تھوڑی سی عزت نفس کو ایک طرف رکھ کر بذات خود عون سے بات کر لیتی۔ وہ اسے بتا دیتی۔ کیسے اور کس طرح سے ماہ رو پہلی نگاہ کی محبت سے گھائل ہوئی تھی۔ اور وہ کس طرح سے بے دھڑک اس کے دل کی سلطنت کا مالک مختار بن گیا تھا۔

ماہ رو' شازمہ کے مجبور کرنے پہ ایک مرتبہ پھر رحمان پلازہ کی وسیع و عریض بلڈنگ کے نیچے اور اوپر ہر فلور پر گھوم رہی تھی۔

اسے آج بھی عون کا سامنا کرنے پر دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ وہ عون کے سامنے کس طرح

سے جائے گی؟ اور کس طرح سے اعتراف محبت کرے گی۔

گو کہ وہ بہت بولڈ تھی۔ بہت ماڈ تھی۔ بہت حاضر جواب تھی۔ لیکن مقابل بھی تو عون تھا۔ اسے سوچ و سمجھ کر اپنا اعتراف محبت اس کی سماعتوں میں اتارنا تھا۔

آج سیل بوائے اسے عون اور اس کے والد' چچا کے مشترکہ دفتر تک لے گیا تھا۔ اس کی خوش نصیبی کے سوا اور کیا تھا جو عون اسے دفتر میں اکیلا مل گیا۔ وہ کمپیوٹر پہ الیکٹرونکس مصنوعات کے نئے نئے ماڈل دیکھ رہا تھا۔

ڈبل ڈائمنڈ کے روح میں اتر جانے والے خوشنما جھونکے کو محسوس کر کے ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھا اور لحہ بھر کے لیے بھونچکا رہ گیا تھا۔

سامنے فریحہ کی وہی سرپھری سہیلی کھڑی تھی۔ ویسی ہی دلفریب' معطر اور تروتازہ۔ لیکن وہ یہاں آئی کیوں تھی؟ اگر موبائل کی کوئی شکایت تھی تو موبائل کاؤنٹر پہ جاتی۔ وہیں مسئلہ لکھواتی۔ موبائل واپس کرتی۔ وہ یہاں اس دفتر میں کیوں آئی تھی؟

عون عباس کا میٹر جیسے لحہ بھر میں ہی گھوم گیا تھا۔ اس کی تیوریاں سی چڑھ گئیں۔ ماتھے پہ بل آگئے۔ غصے میں اس کی رنگت سرخ پڑ گئی تھی پھر بھی وہ خاصے تحمل اور ضبط کے ساتھ بولا تھا۔

"یہاں کیوں آئی ہیں؟ موبائل میں کوئی مسئلہ تھا تو باہر بتاتیں۔" اس نے محض فریحہ کی خاطر بہت تہذیب اور شائستگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ ورنہ ایسی ویسی لسوڑا ٹائپ لڑکیوں کو تو منٹوں میں وہ سیدھا کر کے ان کی عقل ٹھکانے لگا دیتا تھا مگر اس وقت بڑے ضبط سے کھڑا تھا۔

"موبائل ٹھیک ہے۔" وہ بتا نہیں سکی تھی موبائل تو اسی روز ماہ رو نے پرزہ پرزہ کر دیا تھا۔

"تو پھر؟" عون نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔ وہ جلد از جلد اس سے پیچھا چھڑوانا چاہتا تھا۔

ماہ رو جیسے تذبذب کا شکار ہو گئی تھی۔ وہ کیسے بات کرے؟ کس طرح سے کہے؟ لیکن اسے کہنا تو تھا۔ بولنا تو تھا۔ وہ جس مقصد کے لیے آئی تھی اسے کیسے ادھورا چھوڑ کے جاتی۔

"مجھے تم سے کچھ بات کرنی تھی۔" بالآخر ماہ رو نے اپنے ازلی اعتماد کا سہارا لیا تھا۔ اس کی توقع کے مطابق اسے بے انتہا اچنبھا ہوا۔

"کیا؟" وہ اس انداز میں کھڑا ہو گیا تھا جیسے بات سنتے ہی بھاگ کھڑا ہو گا۔ کم از کم اس کے انداز سے یہی لگ رہا تھا۔

"مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے عباس! آئی ریئلی لو یو۔ میں تم سے سچا پیار کرتی ہوں۔" ماہ رو نے اتنے آرام سے یہ الفاظ کہے تھے جیسے کہہ رہی تھی۔ "مجھے نزلہ ہو گیا ہے۔ جس کی دوائی چاہیے۔"

سامنے کھڑا عون عباس تو بھونچکا رہ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں ہی نہیں پورا وجود پتھرا گیا تھا۔ اسے گویا اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اتنا سرد پن ابھر کر سامنے آیا جسے دیکھ کر لحہ بھر کے لیے اس کی ریڑھ کی ہڈی تک سنسنا اٹھی تھی۔ وہ پہلے برف کی طرح سرد ہوا تھا پھر آگ کی طرح جیسے بھڑک اٹھا۔

لیکن ماہ رو اپنے ہی دھیان میں شان بے نیازی سے بولتی جا رہی تھی۔ جیسے یونی ورسٹی میں بے تکان بولتی تھی۔ جیسے ڈیڈی کے سامنے بولتی تھی۔ اس کا انداز وہی تھا۔ شاہانہ' کچھ مغرورانہ۔ شان بے نیازانہ۔ وہ بڑی ترنگ اور موڈ میں اعتراف محبت کر رہی تھی۔ اسے اپنی وہ تمام فیلنگز بتا رہی تھی جو ماہ رو نے محسوس کی تھیں۔ وہ آنسو بھی جو اس کی بے اعتنائی پہ بہتے تھے۔

ماہ رو تین منٹ کے اندر اندر بہت جذب کے عالم میں بڑی دلیری کے ساتھ اپنی حکایت دل سنا چکی تھی۔ پھر جب وہ خاموش ہوئی تو عون کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر اتنا تعجب' غصہ اور زہر تھا ماہ رو جیسے لحہ بھر کے لیے سن ہو گئی تھی۔

اس کے خاموش ہوتے ہی وہ گہرے کاٹ دار زہریلے لہجے میں دھیمی آواز کے ساتھ پھنکارا تھا۔

"کچھ رہ گیا ہے یا اور.... ؟" اس کے لہجے اور آواز میں آگ کی حدت سے بڑھ کر گرماہٹ تھی۔ پہلی مرتبہ اتنا روانی سے بولنے کے بعد ماہ رو کچھ گڑبڑائی تھی۔ اسے عون کے تیور کچھ ٹھیک نہیں لگ رہے تھے۔ اس کا دل سوکھے پتے کی طرح کانپ گیا تھا۔

عون دو قدم چل کر آبنوسی دروازے تک پہنچا تھا پھر اس نے ہینڈل گھما کر ڈور کھول دیا تھا۔ پھر اس نے زہر خند لہجے میں غضبناک تیور کے ساتھ کہا۔

"دفع ہو۔" اس کا لہجہ سانپ کی طرح پھنکار تا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آگ برس رہی تھی۔ عون غصے میں تھا۔ اور عون بے انتہا غصے میں تھا۔ ماہ رو کو یوں لگا اگر وہ ایک منٹ بھی وہاں رکتی تو زندہ حالت میں کبھی اپنے گھر نہ لوٹتی۔ اس کے لیے عون کا رویہ سمجھنا بہت دشوار تھا۔ وہ اتنی حسین' عالی شان ماہ رو کے منہ سے اظہار محبت سن کر بجائے خوش ہونے کے آگ بگولا کیوں ہو گیا تھا۔

اگر وہ کسی عام شخص کی سماعتوں میں یہ سب انڈیلتی تو شاید اس کا مارے خوشی سے ہارٹ اٹیک ہو جاتا۔ لیکن عون عباس کا رویہ بہت حیران کن تھا۔ بہت تکلیف دہ تھا۔ بہت توہین آمیز تھا۔ ماہ رو جیسے سچ کر رو پڑی تھی۔ پھر وہ منہ پر ہاتھ رکھے روتی رہی۔ روتی رہی۔ ایک مرتبہ پھر وہ رحمان پلازہ سے روتی ہوئی نکل رہی تھی۔ اور اس کے پیچھے عون عباس کا پھنکار تا نفرت سے بھرا عکس بھی ساتھ آرہا تھا۔ آج ایک مرتبہ پھر اس کو ٹھوکر لگی تھی اور بڑی زور کی ٹھوکر لگی تھی۔ اس کی محبت کو عون عباس کے ایک لفظ "دفع ہو" نے دھتکار دیا تھا۔ ٹھکرا دیا تھا۔

وہ شازمہ کے کہنے پر اپنی عزت نفس کو مجروح کر کے زخم زخم سی جا رہی تھی۔ اس حال میں کہ اس کے بال بکھر رہے تھے۔ چہرہ آنسوؤں سے تر بتر تھا۔

یہ تو عون عباس تھا۔ جس کی نفرت اور زہر کو شان سے وصول کر کے وہ شکستہ دل' بکھرے حواسوں اور ٹوٹ پڑتی رنجیدگی کے ساتھ واپس جا رہی تھی۔

دل پر چوٹ پڑی تو اسے اذیت کے ہر رنگ سے آشنائی بھی ہو گئی تھی۔ اسے پارکنگ کی طرف جانا تھا۔ لیکن وہ فٹ پاتھ پہ چل رہی تھی۔ ویسے ہی دیوانوں کی طرح۔ اس کے لمبے ریشم جیسے بال اڑ اڑ کر اس کے منہ پر پڑ رہے تھے۔ اسے چلتے چلتے کئی مرتبہ ٹھوکر لگی تھی۔ کئی مرتبہ وہ زمین پر گرتے گرتے بچی تھی۔ اسے عون کا رویہ بھولتا ہی نہیں تھا۔ اس کا غصے سے بھرا چہرہ' زہریلے تاثرات۔ لہجے میں پھنکار تا ہوا "دفع ہو"۔

کوئی ایسے بھی کرتا ہے؟ کوئی محبت کی اس قدر توہین کرتا ہے؟ وہ محبت جو چل کر اس کے قریب آئی تھی۔ اس کے قدموں میں گری تھی۔ اپنا آپ حقیر کیا تھا۔ اس قدر ارزاں کیا تھا۔ اور اس نے بدلے میں کیا کیا؟ ایک ہی ٹھوکر میں دھتکار دیا۔ ٹھکرا دیا۔ اسے چلتے چلتے پھر سے ٹھوکر لگی۔ وہ گرتے گرتے بمشکل بچی تھی۔ اس کے پیچھے کوئی آواز دے رہا تھا۔ کوئی بھاگ کر آرہا تھا۔ "ماہ رو' ماہ رو" پکار رہا تھا۔ اور ماہ رو پیچھے مڑ کر آنے والے کو دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔

کیا وہ آواز عون عباس کی تھی؟ یا ایک الوژن؟ وہ آتی جاتی کربناک ہواؤں سے پوچھ رہی تھی۔

(باقی آئندہ)

